تعلیم و تربیت

تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا

دسمبر 2002

عید مبارک

62واں سال - نواں شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

(رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر
عبدالسلام

ایڈیٹر/پبلشر
ظہیر سلام

مشیر خاص
سید مقبول حسین شاہ

مشیر
سعید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد جاوید امتیازی

السٹریٹر/لے آؤٹ
سید شوکت اعجاز

سرکولیشن اسسٹنٹ
محمد بشیر راہی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

کہیے کیسے ہیں آپ لوگ' ٹھیک ہیں نا! "تعلیم و تربیت" کے سنگ یونہی ہنستے مسکراتے اور ہر قدم پر کامرانیوں اور کامیابیوں کے پھول چنتے رہیں۔ ہاں تو بچو! ہماری طرف سے دوہری مبارکباد قبول کیجئے' ایک عیدِ سعید کے پرمسرت موقع پر اور دوسری سالِ نو 2003ء کے حوالے سے! اچھی خوشیوں اور مبارکباد کے اصل حق دار تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں محنت اور جدوجہد کو اپنا شعار بناتے اور ایمان واستقامت کے ساتھ خدا و رسول ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے حقوق و فرائض کو پہچانتے ہیں اور اپنے ملک' اپنی قوم اور سارے بھائی بندوں کی بہتری اور اصلاح کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ آپ سب ساتھی ایسے خوش قسمت اور کامیاب لوگوں میں یقیناً شامل ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ماشاء اللہ آپ میں سے بہت سارے بچوں نے رمضان المبارک کے روزے بھی باقاعدہ رکھے اور تلاوتِ قرآن پاک کے ساتھ ساتھ نمازوں کا بھی خوب اہتمام کیا۔ یہ بات ہمارے لیے اور بھی خوشی اور طمانیت کا باعث ہے۔ ننھے ساتھیو! انسان کی کامیابی کا راز نیک اعمال اور کوشش و جدوجہد میں پوشیدہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ جان لیجئے کہ ہمارا دین دنیا بھر کے انسانوں کے لیے امن و سلامتی کا علمبردار ہے۔ اچھے مسلمان بنئے' اور ہر ایک کی اصلاح و بہتری کے لیے کوشاں اور دعاگو رہیے۔ عید کی خوشیاں آپ کو مبارک ہوں' اِن خوشیوں میں ان لوگوں کو ضرور یاد رکھیں جو کسی وجہ سے محرومی کا شکار ہیں۔ نئے سال کو نئے عزم کے ساتھ خوش آمدید کہیے! ہم آپ کے لیے دعاگو ہیں۔ (ایڈیٹر)

Rehan Books
G-9 Markaz, Karachi Co. Islamabad
Ph: 051-225 25 27 - 265 1374

آیندہ شمارے میں

نیاسال' نیاانداز

بفضلِ خدا جنوری 2003ء سے ہم آپ کے لیے لارہے ہیں دلچسپ کہانیوں پر مبنی سائنسی و تاریخی واقعات' کارٹونز' اصلاحی' سبق آموز اور ہنستی مسکراتی تحریروں پر مشتمل بہت سے سلسلے...... نئے ولولے اور نئے انداز کے ساتھ۔ انشاء اللہ!

اس شمارے میں

قائداعظمؒ (نظم)	ناصر زیدی	2
غلطی کی تلاش	نذیر انبالوی	3
درسِ قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	7
احساس	محمد فاروق دانش	8
عید اور ایک یتیم بچہ (نظم)	تاج انصاری	12
آؤ کشتی لڑو	حسن ذکی کاظمی	13
دُور دنیا کا مرے دم سے......	شازیہ نور	19
حیران کن	سید شوکت اعجاز	24
ہاتھی والے	نیاز علی بھٹی	25
شاباش چوچو	معروف احمد چشتی	28
کھیل اور کھلاڑی	سید شوکت اعجاز	32
آؤ دیا جلائیں (نظم)	عباس العزم	36
سرخ چھتری	زبیدہ سلطانہ	37
صحت کی حفاظت	جاوید امتیازی	39
قائداعظمؒ اور بچے	شیخ عبدالحمید عابد	40
بڑا آدمی	احمد حسن رانجھا	42
کارٹون کہانی	شاہد ریاض شاہد	48
نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز	وجیہہ طاہر	47
قائدؒ کا بچپن	جمشید اختر	50
مہرِ نبویؐ	جاوید امتیازی	52
فائل کی گمشدگی	منظر رضا ہاشمی	58

باقی دلچسپ سلسلے حسبِ معمول

سرورق: عید مبارک

دسمبر 2002ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32-ایمپریس روڈ' لاہور
U.A.N: 042-111-62-62-62 Fax: 042-6369204
Email: support@ferozsons.com.pk
Website: http://www.taleemotarbiat.com

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بنک ڈرافٹ' چیک یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ تعلیم و تربیت 32-ایمپریس روڈ' لاہور کے پتہ پر ارسال کریں۔
فون: 6361309-6361310-6278815 فیکس: 6278816

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =750 روپے۔
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =830 روپے۔
امریکا اور مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) =950 روپے۔

پرنٹر: عبدالسلام: مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60-شاہراہ قائداعظم لاہور

قائدِ اعظمؒ

ناصر زیدی

سب سے اُلفت کرنے والا
ملّت کا دَم بھرنے والا
قوم کی آنکھوں کا وہ تارا
ہم کو جان و دل سے پیارا
جس نے وطن کے نغمے گائے
خوشیوں کے پیغام سُنائے
جس نے سوتوں کو بھی جگایا
آزادی کا گیت سنایا
جس نے وطن کو عزت بخشی
شہرت بخشی، عظمت بخشی
جس نے عمل کا درس دیا ہے
جس نے کل کو آج کیا ہے
اچھے بچّو میرے پیارو!
پاکستان کی آنکھ کے تارو!
وہ تھا سب سے اچھا سچّا
قائدِ اعظمؒ نام تھا اُس کا

by Ahmad Sajjad

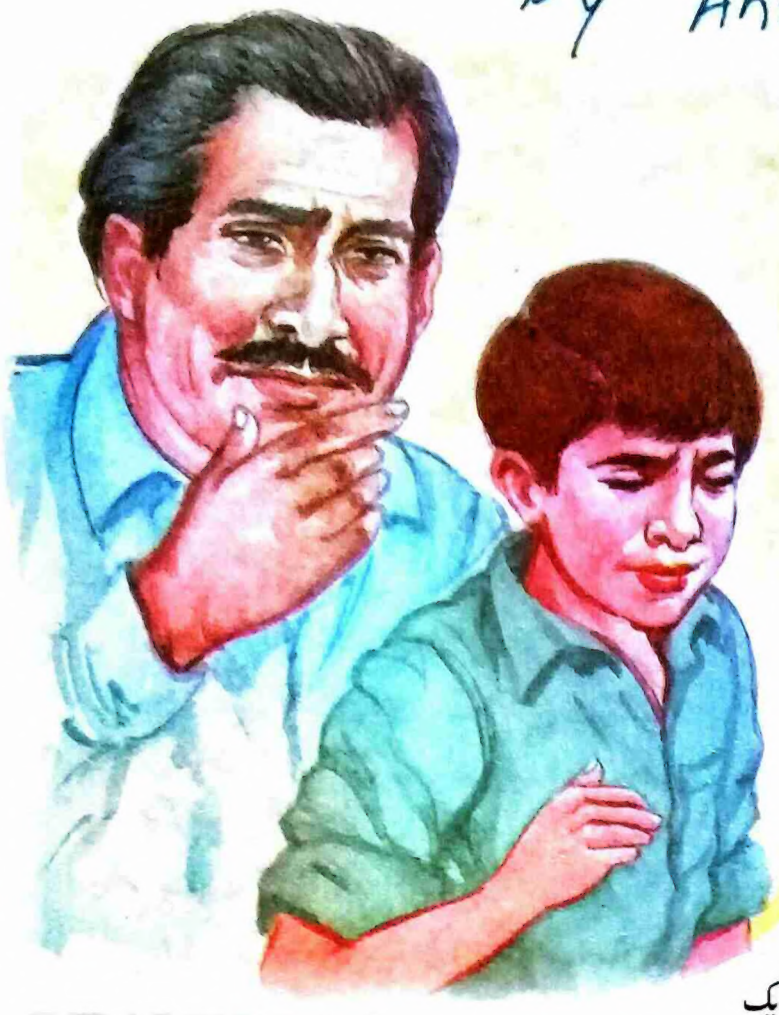

غلطی کی تلاش

نذیر انبالوی

ویڈیو فلم وی سی آر میں لگا کر شہباز نے پلے کا بٹن دبایا تو چند لمحوں بعد ٹی وی سکرین پر ایک بڑا سا بینر دکھائی دینے لگا جس پر لکھا تھا "مڈل کے امتحان میں شان دار کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کے اعزاز میں ایک تقریب"۔ شہباز ہال کے داہنی دروازے سے اندر داخل ہوا اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ ہال میں آہستہ آہستہ حاضرین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ شہباز کی امی جان خواتین کے لئے مخصوص نشستوں والے حصے میں بیٹھیں اپنے بیٹے کو شفقت بھری نظروں سے تک رہی تھیں۔ شہباز کی نظریں سٹیج پر جمی تھیں۔ تقریب کا آغاز عین وقت مقررہ پر تلاوت کلامِ پاک سے ہوا۔ تلاوت کے بعد نعت رسول مقبولؐ پیش کی گئی۔ تعلیمی بورڈ کے چیئرمین نے اپنے خطاب میں آنے والے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور طلبہ و طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسی طرح محنت جاری رکھیں اور ملک و ملت کے لیے اپنا کردار شاندار طریقے سے ادا کریں۔ صوبائی گورنر اس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے۔ ان کی تقریر کے بعد انعامات کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب شہباز کی باری آئی تو کمپیئر نے کہا:

"معزز حاضرین! میں اب جس ہونہار طالب علم کو سٹیج پر بلا رہا ہوں اس نے نہ صرف مڈل کے امتحان میں صوبہ بھر میں اول پوزیشن حاصل کی ہے بلکہ وہ اس سے پہلے پرائمری کے بورڈ کے امتحان میں بھی صوبہ بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔ اپنی تالیوں سے اس ذہین طالب علم کی بھرپور حوصلہ افزائی کیجئے! تو تشریف لاتے ہیں شہباز اکبر!" شہباز تالیوں کی گونج میں سٹیج کی طرف بڑھا۔ اس نے گورنر کے ہاتھ سے گولڈ میڈل، تعریفی سند اور دس ہزار روپے نقد انعام حاصل کیا۔ گورنر نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا:

"شاباش بیٹا شاباش! ملک کو تمہارے جیسے ذہین بچوں کی ضرورت ہے۔ تم اسی طرح محنت کرتے رہے تو زندگی کے میدان میں کامیاب ہوتے چلے جاؤ گے"۔

سٹیج سے اترتے ہی امی جان نے شہباز کا ماتھا چومتے ہوئے کہا:

"بیٹا! مجھے تم پر ناز ہے"۔

امی جان کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ شہباز بولا:

"آج یہاں ابو جان ہوتے تو کتنے خوش ہوتے"۔

"ہاں واقعی بہت خوش ہوتے' وہ اب بھی ہمارے ساتھ اس تقریب میں شریک ہو سکتے ہیں"۔

"وہ کیسے؟" شہباز نے پوچھا۔

'تمہارا دوست جواد جو اس تقریب کی ویڈیو فلم بنا رہا ہے ہم یہ فلم تمہارے ابا جان کو کویت بھیج دیں گے۔ یہ فلم دیکھ کر یقیناً وہ ایسا ہی محسوس کریں گے کہ جیسے وہ خود ہمارے درمیان موجود تھے"۔ شہباز سمجھتا تھا کہ امی جان نے اس کا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ اس نے امی جان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

تقریب کے اختتام پر کمپیئر نے حاضرین کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ ان کی تواضع کے لیے چائے کا بندوبست کیا گیا ہے تو حاضرین نظم و ضبط کے ساتھ ہال کے ساتھ والے لان تشریف لے چلیں!

اس طرح شہباز بھی اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب اور امی جان کے ساتھ لان میں داخل ہوا۔

"بہن جی! شہباز جیسے بچے تو ہماری قوم کا سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کو نظر بد سے بچائے اور مزید کامیابیاں عطا کرے"۔

"آمین" امی جان بولیں۔

چائے پینے کے دوران بہت سے لوگوں نے شہباز کو شاباش دی اور اخبارات کے فوٹو گرافروں نے اس کی تصویریں بنائیں۔

"جواد تم بھی کچھ کھا پی لو"۔

"میں تو اب گھر چل کر ہی کچھ کھاؤں گا"۔ جواد ویڈیو فلم بناتے ہوئے بولا۔

☆☆☆☆

ڈیڑھ گھنٹے کی یہ فلم ختم ہوئی تو شہباز سوچ میں پڑ گیا کہ اس فلم میں غلطی کہاں ہے؟ اس نے فلم کے ایک ایک منظر کو غور سے دیکھا تھا مگر وہ غلطی تلاش نہ کر سکا۔ شہباز نے پچھلے دنوں اس ویڈیو فلم کی ایک کاپی ابا جان کو کویت بھیجی تھی۔ دو دن پہلے ہی اُن کا فون آیا تھا۔ شہباز نے دعا سلام کے بعد پوچھا تھا:

"ابا جان تقریب کی ویڈیو فلم کیسی لگی؟"

"فلم تو شاندار ہے مگر"۔

"مگر کیا؟" شہباز نے پوچھا۔

"فلم میں ایک بہت بڑی غلطی ہے"۔

"بہت بڑی غلطی؟" شہباز نے دہرایا۔

"جی فلم میں بہت بڑی غلطی ہے" ابا جان بولے۔

"ابا جان! وہ غلطی کیا ہے؟"

"فلم میں سے تم نے غلطی کو خود تلاش کرنا ہے۔ غلطی بھی بہت بڑی ہے۔ اس کی تلاش پر تمہیں انعام ملے گا۔ تم نے اگر غلطی تلاش کر لی تو عید الفطر کے موقع پر جب میں پاکستان آؤں گا تو تمہارے لیے ایک انعام لاؤں گا"۔

"ابا جان میں غلطی تلاش کرنے کی کوشش کروں گا"۔

شہباز نے ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ ویڈیو فلم نکال کر وی سی آر پر دیکھنے لگا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی فلم دیکھی تھی مگر وہ غلطی تلاش نہ کر سکا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی الجھن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

شام کے وقت اس نے امی کے ساتھ مل کر ویڈیو فلم دیکھی۔ جب فلم ختم ہوئی تو شہباز نے امی جان سے کہا:

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ فلم میں غلطی کہاں ہے"۔

"میں بھی غلطی تلاش نہیں کر پائی"۔

"امی جان ہو سکتا ہے فلم میں کوئی غلطی نہ ہو"۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ فلم میں کوئی غلطی ہو گی تو تمہارے ابا جان نے تمہیں تلاش کرنے کے لیے کہا ہے۔ میں بھی غور کرتی ہوں اور تم بھی غور کرو۔ شاید ہم غلطی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں"۔ یہ کہہ کر امی جان کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

اب تو شہباز گھر میں ہوتا یا سکول میں مسجد میں ہوتا یا

کھیل کے میدان میں ایک ہی خیال اس کے ذہن میں سمایا ہوا تھا کہ ویڈیو فلم میں غلطی ہے تو آخر کہاں؟ اس نے یہ معاملہ اپنے دوستوں کے سامنے رکھا تو نوفل فوراً بولا۔

"یہ کونسا مشکل کام ہے میں ایک مرتبہ فلم دیکھ لوں گا تو غلطی تلاش کر لوں گا"۔

"شہباز تو یہ کام کئی مرتبہ فلم دیکھ کر بھی نہیں کر سکا"۔ بلاول نے کہا۔

"میں یہ کام ایک ہی مرتبہ فلم دیکھ کر کر لوں گا"۔

"شہباز کیا خیال ہے نوفل کو آزما لیا جائے"۔ محمد علی نے کہا:

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ غلطی کو تلاش کر لیا جائے۔ یہی میرے لیے کافی ہے"۔ شہباز کی بات سن کر نوفل نے کہا:

"تم فکر ہی نہ کرو میں فوراً غلطی تک پہنچ جاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ ہمیں تمہارے گھر کب آنا ہے؟" پرسوں اتوار کی چھٹی ہے اسی دن آجاؤ۔ دوپہر کا کھانا بھی کھائیں گے اور غلطی کو بھی تلاش کریں گے"۔ شہباز بولا۔

اتوار کے دن نوفل، بلاول اور محمد علی شہباز کے گھر موجود تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی فلم انہوں نے روک روک کر اڑھائی گھنٹے میں ختم کی مگر وہ غلطی تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نوفل شرمندہ سا تھا کہ دعویٰ کرنے کے باوجود وہ غلطی کی نشاندہی نہ کر سکا۔ اتوار کی رات ہی کو ابا جان کا کویت سے فون آگیا۔ علیک سلیک کے بعد اُن کا پہلا سوال تھا۔ "بیٹا! غلطی تلاش کر لی ہے یا نہیں"۔

"نہیں ابا جان"۔

"بیٹا کوشش جاری رکھو"۔

"ابا جان کوئی اشارہ دیں جس سے میں غلطی تک پہنچ سکوں"۔

"اچھا تو کوئی اشارہ چاہتے ہو"۔ ابا جان بولے۔

"جی ابا جان"۔

"تم ٹیلی فون ریسیور کس ہاتھ میں پکڑے مجھ سے بات کر رہے ہو؟"

"بائیں ہاتھ میں" شہباز نے اتنا کہا تو ابا جان بولے:

"ریسیور دائیں ہاتھ میں پکڑ لو" شہباز نے فوراً ابا جان کا حکم مانتے ہوئے ریسیور دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"ابا جان اب ریسیور میرے دائیں ہاتھ میں ہے"۔

"بیٹا میں نے تمہیں اشارہ دے دیا ہے اب دوبارہ ویڈیو فلم دیکھو اور غلطی کو تلاش کرو"۔ فون بند ہوتے ہی شہباز نے دہرایا۔

"بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ تک"۔

اشارہ پانے کے باوجود شہباز غلطی تلاش نہ کر سکا۔ اب اس کے پاس ابا جان کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اُس کے ابا جان رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں پاکستان آگئے۔ شہباز کو اس لمحے کا انتظار تھا کہ ابا جان غلطی کی نشاندہی کریں جو پچھلے ایک ماہ سے شہباز کے لیے معما بنی ہوئی تھی۔ آخر یہ طے ہوا کہ چاند رات کو ابا جان غلطی کی نشاندہی کریں گے۔ شہباز اور اس کے گھر والوں نے پہلے ہی عید کی تیاری کر لی تھی اس لیے چاند رات کو جلد ہی ابا جان ویڈیو فلم لگا کر بیٹھ گئے۔ سبھی خاموشی سے فلم دیکھتے جا رہے تھے۔ جب تقریب کے خاتمے پر تواضع کا مرحلہ آیا تو ایک منظر کو دیکھتے ہوئے ابا جان نے کہا۔

"یہ دیکھو یہی غلطی ہے"۔

یہ منظر اتنی تیزی سے گزرا کہ اسے دوبارہ دیکھنا پڑا۔

اس منظر میں پانی کا گلاس شہباز کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک شخص سے باتیں کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے پانی پی رہا تھا۔ جب یہ منظر گزرا تو ابا جان نے کہا:

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ "جب کوئی کھانا کھائے تو سیدھے ہاتھ سے کھائے اور پانی پیئے تو سیدھے ہاتھ سے پیئے"

یہ سن کر شہباز اور اس کی امی جان دونوں ہی دنگ رہ گئے۔ وہ کوشش کے باوجود غلطی تلاش نہ کر سکے تھے۔ ابا جان صورت حال دیکھ کر بولے:

شہباز! کیا آئندہ یہ غلطی دہراؤ گے"۔

"نہیں بالکل نہیں" یہ سن کر ابا جان نے اپنی جیب سے ایک سنہری گھڑی نکال کر شہباز کی طرف بڑھائی۔

"یہ تمہارا انعام ہے"۔

"مگر میں تو غلطی تلاش نہیں کر سکا' پھر انعام کیسا؟ شہباز بولا۔

"یہ درست ہے کہ تم سے غلطی کی تلاش نہیں ہو سکی مگر تم نے ابھی یہ غلطی نہ دہرانے کا عہد کیا ہے۔ یہ انعام اسی عہد کی وجہ سے دے رہا ہوں۔ اسے تم عید کا تحفہ بھی سمجھ سکتے ہو"۔

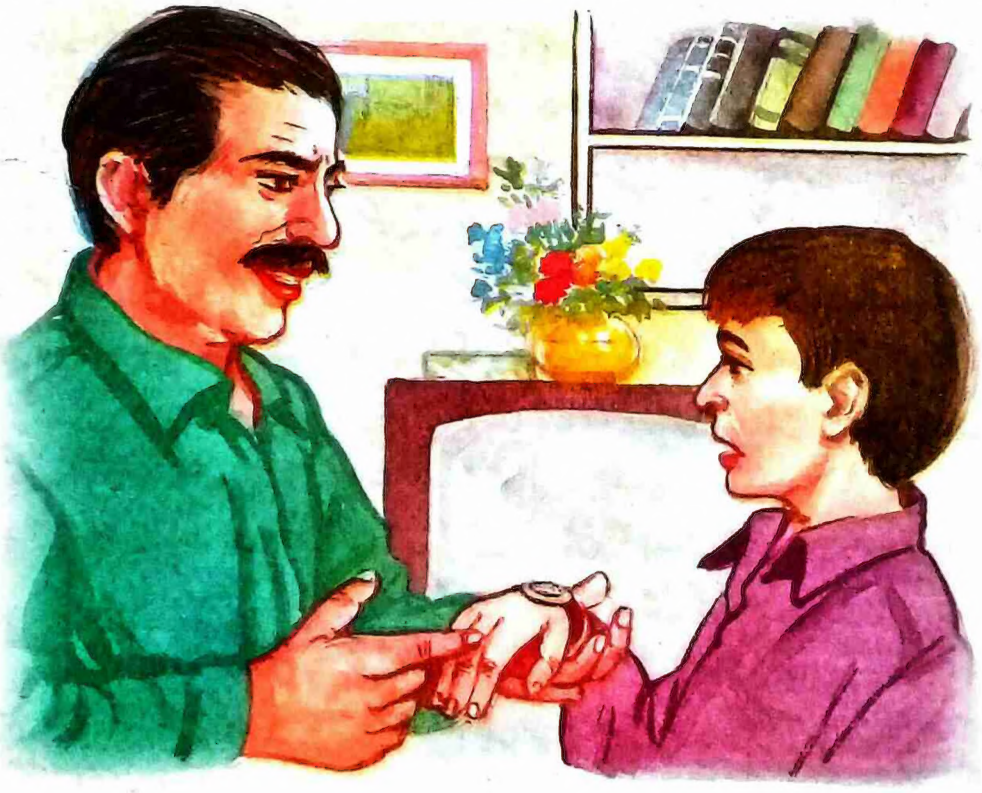

"ابا جان آپ نے اس سنہری گھڑی سے بڑھ کر مجھے عید کا تحفہ ایک پیاری سی حدیث مبارکہ کی صورت میں دے دیا ہے۔ میں اس پر عمل کروں گا"۔ یہ کہہ کر شہباز نے سنہری گھڑی بائیں کلائی کی بجائے دائیں کلائی پر باندھی تو اس کا یہ عمل دیکھ کر امی اور ابو دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

اِنسان اپنے خیالوں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ گندے مندے خیالات انسان کو تنزل اور تباہی تک بھی پہنچا دیتے ہیں۔ نیک اور اچھے خیالات تعمیر و ترقی کا سبب بنتے ہیں۔

سورۃ نمبر 4 کی آیت نمبر 135 کے یہ درمیانی الفاظ بری خواہشوں اور برے خیالوں سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

لَاتَتَّبِعُو الْهَوٰٓى

بری خواہشوں کی پیروی نہ کرو!

موجودہ زمانے میں انسان پر کئی سمتوں سے گندے مندے خیالوں اور بری خواہشوں کی بے تحاشا یلغار ہوئی ہے۔ فحش ادب عام ہو گیا ہے۔ ٹیلی ویژن کے بعض پروگرام فحش حرکتوں کی اشاعت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ سکولوں میں ایسے بچوں کی تعداد بھی خاصی بڑھ گئی ہے جو خود بھی بہکے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنے ہمجولیوں کو بھی ورغلانے اور پھسلانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ نئی نسل سوچ کی گمراہی اور اخلاقی بدحالی میں بہت بری طرح پھنس چکی ہے۔ اپنے آپ کو بے حیائی اور بے راہ روی کے طوفانوں کے حوالے کر دینا کوئی دانشمندی نہیں ہیں۔ تدارک علاج سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ گندے مندے خیالوں' تفریحوں اور بری صحبت سے دور ہی رہا جائے۔ اس قسم کے تعمیری مشغلوں میں زیادہ سے زیادہ شمولیت بہترین لائحہ عمل ہے: (۱) مسجد سے تعلق بڑھانا' باجماعت نمازوں سے لطف اندوز ہونا اور مسجد میں آنے والے بچوں سے دوستی بڑھانا (۲) اچھی اچھی تفریحوں اور منظم کھیلوں میں حصہ لینا (۳) بچوں کے لیے لکھے ہوئے تعمیری ادب کا باقاعدہ مطالعہ کرنا (۴) اساتذہ والدین اور معاشرے کے دیگر بزرگوں کی ہدایت و رہنمائی سے مستفید ہوتے رہنا وغیرہ۔ ایسی مفید باتوں سے گندے مندے خیالوں پر قابو پانا اور تعمیر و ترقی کی منزلوں کی طرف قدم بڑھانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

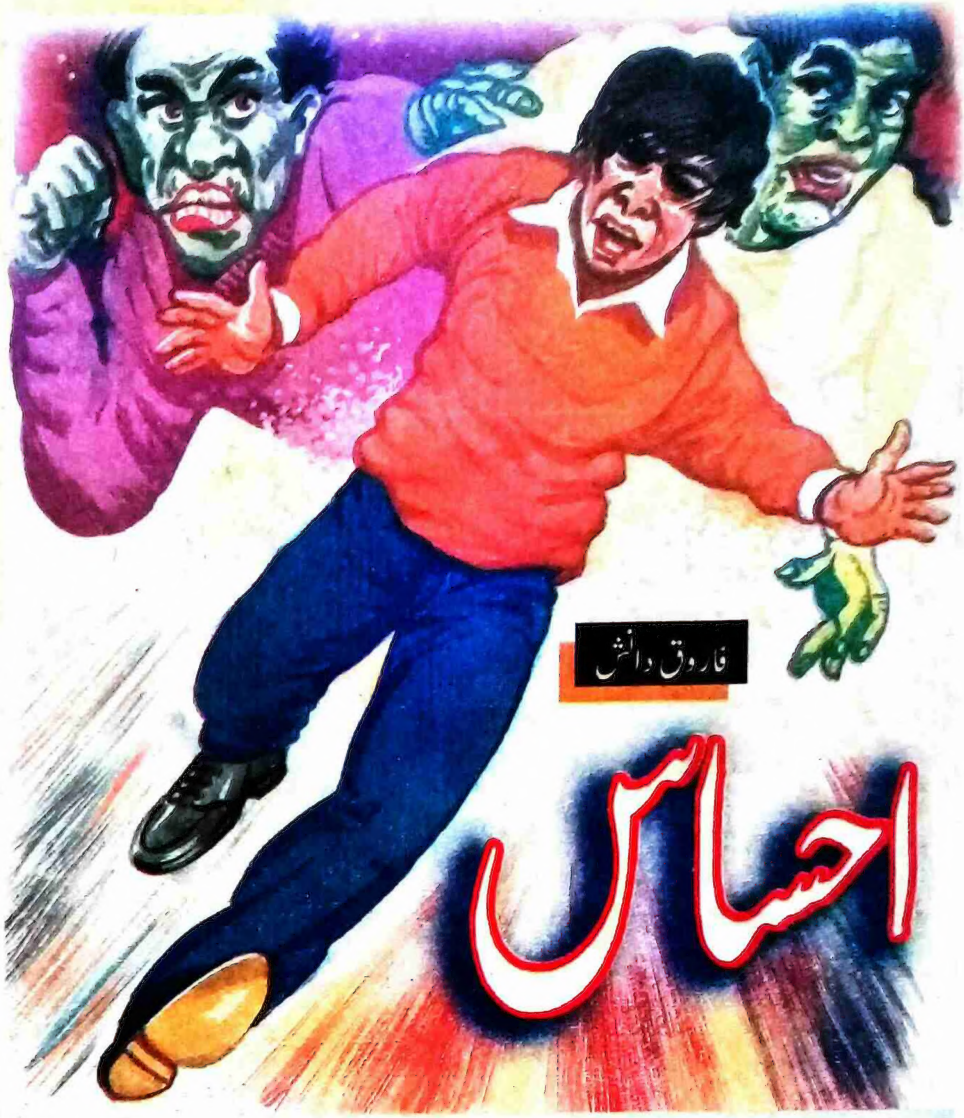

احساس

فاروق دانش

وہ تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ دل سینے میں تیزی سے اُچھل رہا تھا۔ اس کا سارا جسم سردی کے باوجود پسینے میں شرابور تھا۔ ان تمام باتوں سے بے نیاز وہ صرف اور صرف دوڑنے میں مصروف تھا۔ کبھی کبھار وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا اور پھر کوشش کرتا کہ مزید تیز بھاگے۔ اُس کے پیچھے دو لمبے تڑنگے سیاہ فام تھے جو چاہتے تھے کہ کسی طرح اُسے قابو کر لیں۔ اس کے اندر اتنی طاقت جانے کہاں سے آگئی تھی کہ وہ ان ہٹے کٹوں کے مقابلے میں دوڑ رہا تھا اور اب تک ان کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔

دوڑتے دوڑتے اب وہ جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔ درختوں، شاخوں اور ان کے پتوں سے اُلجھتا وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اُن دونوں میں سے شاید کسی ایک کا پاؤں درخت کی ٹہنی سے اُلجھا تھا جس کے باعث وہ زمین پر آرہا۔ ایک نوکیلے پتھر سے اُس کا سر ٹکرایا تو خون بھی بہہ نکلا۔ اُس کے دوسرے ساتھی نے اُسے ہاتھ کے سہارے سے اُٹھایا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے خون کو صاف کیا اور پھر دونوں اُس لڑکے کی تلاش میں دوڑ پڑے۔

اُس نے جب محسوس کیا کہ اب پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز نہیں آئی تو اُس نے کہیں چھپ کر اپنی جان بچانے کا فیصلہ کیا اور ایک ٹیلے کی اُوٹ میں چھپ گیا۔ وہ دونوں دوڑ کر اُس طرف آئے مگر اُسے نہ دیکھ سکے اور آگے کی طرف بڑھ گئے۔ اُس نے سوچا کہ اب باہر نکل کر پھر مخالف سمت کی طرف دوڑ لگا دی جائے جہاں سے وہ آیا تھا تاکہ ان سے چھٹکارا پا سکے۔ ٹیلے پر ہاتھ کا سہارا لے کر وہ باہر نکلا تو ایک پتھر پھسل کر نیچے گرا اور اُس کی آواز سے وہ دونوں پلٹے۔ اب اُن کا رخ دوبارہ اُس کی طرف ہو گیا۔

اُس کی سانسیں پھر سے بے ترتیب ہو گئیں۔ چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا لیکن مصیبت تھی کہ گلے لگنا چاہتی تھی۔ دوڑتے ہوئے وہ ایک اترائی تک پہنچ گیا۔ پاؤں سلپ ہوا تو وہ دس بارہ فٹ خود بخود نیچے آرہا اور کافی دور تک قلابازیاں کھاتا ہوا آگے میدان میں پہنچ گیا۔ یہ قدرت کی طرف سے اس کے لیے مدد تھی۔

لیکن یہ مدد اُس کے لیے ناکافی تھی۔ وہ اُٹھ کر بھاگنے لگا۔ وہ دونوں اُس اترائی تک آئے۔ نیچے اترے اور اس کی جانب دوڑنے لگے۔

اب اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ تیز دوڑتے قدموں میں تھکاوٹ نمایاں تھی۔ قدم سست ہونے لگے اور اس کا حوصلہ

پست ہوتا گیا۔ اُن کی رفتار بڑھی اور چار لمبے ہاتھوں نے اُسے جکڑ لیا۔

"چھوڑو، مجھے نہیں پکڑو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے"۔ "اُس نے یہ الفاظ بڑی مشکل سے ادا کیے۔ اُنہوں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور گھسیٹ کر ایک طرف لے جانے لگے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے چھوڑ دو" اب کی بار اُس نے اپنی پوری توانائی یکجا کرتے ہوئے چلا کر کہا لیکن اُن پر اس کے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اسے خاموشی سے ایک طرف لے کر چلتے رہے۔ ایک بڑے سے درخت کے پاس پہنچے تو اُن میں سے ایک نے اپنا ہاتھ اُس پر سے ہٹایا اور اپنی پتلون کی جیب میں ڈالا۔ اُس سے ایک رسی برآمد ہوئی۔ انہوں نے اسے درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا کیا۔ ایک ہاتھ ایک شاخ کی طرف پھیلایا اور دوسرا ہاتھ دوسری شاخ کی طرف۔ دوسرے نے بڑی پھرتی کے ساتھ اُسے باندھنا شروع کر دیا۔

انہوں نے اسے درخت کے ساتھ بُری طرح جکڑ دیا۔ وہ ہلنے جلنے کے لائق بھی نہ رہا۔ اُس نے بار بار چلا کر اُن سے سخت احتجاج کیا لیکن ان پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اب چڑ کر ایک شخص نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں کے ساتھ ساتھ زبان چلانے سے بھی معذور ہو چکا تھا۔

اب ایک نے اپنی جیب سے کوڑا نکالا۔ پہلے اس نے کوڑے کو ہوا میں لہرایا اور دوسری بار وہ اس کے ایک ہاتھ پر پڑا۔ تکلیف کی شدت سے وہ چلا اٹھا لیکن اس کی یہ چیخ حلق سے ٹکرا کر واپس چلی گئی۔ دوسری بار ہنٹر دوسرے ہاتھ پر پڑا۔ اس کے بعد اس کی ایک ٹانگ پر پھر دوسری پر پھر پیٹ پر اور پھر پیٹھ پر۔

جب چند کوڑے پڑ چکے اور وہ تھوڑی سی بھی جنبش نہ کر سکا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ یہ لوگ اُسے ایسی سخت سزا دے رہے ہیں۔ اس کا قصور بھی نہیں بتا رہے اور نہ ہی اس پر رحم کھا رہے ہیں۔ ایک نو عمر لڑکے پر دو مشٹنڈوں کا ظلم قابل دید تھا۔ وہ رو رہا تھا لیکن ان کا ہاتھ نہ رکا برابر ہنٹر برساتے رہے۔

اب کی بار کوڑا اس کے سر پر پڑا۔ خون کا پھوارا بہہ نکلا اور وہ شدت تکلیف سے چلا اُٹھا مگر اُس کی چیخ پھر دب گئی۔ اب انہوں نے ستانے کا سوچا۔ ایک نے ہنٹر کو ایک طرف رکھا اور دوسرے سے کہنے لگا:

"اس لڑکے نے ہمیں تھکا دیا ہے۔ بھوک خوب چمک اُٹھی ہے"۔

"میرا بھی کچھ یہی حال ہے"۔ دوسرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیوں نہ پہلے کھانے کا کچھ انتظام کیا جائے بعد میں اس سے نمٹتے ہیں"۔ اب کی بار دوسرے نے بھی اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ اسے ان دونوں کا ہنسنا زہر لگ رہا تھا لیکن وہ اپنی نفرت کا اظہار کسی طرح بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔

ایک کو شاید کچھ خیال آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے رومال نکالا اور چہرے سے بہنے والے خون کو صاف کر کے رومال ایک طرف پھینک دیا۔

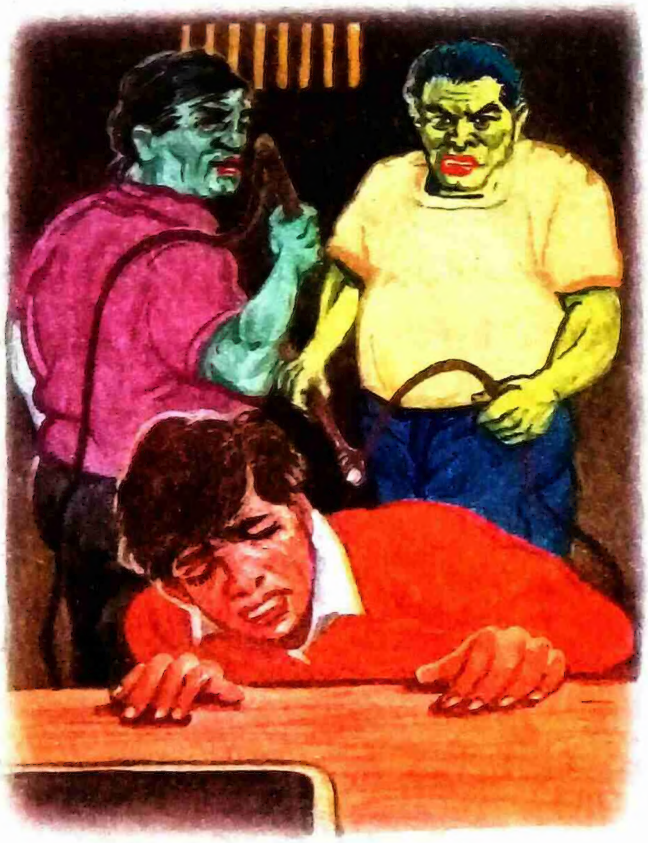

اُسے ایک موقع ہاتھ آگیا منہ کھلتے ہی اس نے اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے جو جی میں آیا بکنا شروع کیا لیکن وہ اسے بور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح کا اظہار کر رہے تھے جیسے وہ دونوں بہرے ہوں اور اس کی آواز ان کی سماعتوں سے قطعی نہیں ٹکرا رہی۔ کھانے کا خیال آتے ہی وہ ایک جانب چل دیئے۔

اُس نے سوچا کہ راہ فرار کی کوئی صورت نکالی جائے۔ اس نے ہلنے جلنے کی کوشش کی لیکن اُسے سخت مایوسی ہوئی اس لیے کہ اسے اس بری طرح مضبوطی سے جکڑا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہلا بھی نہ سکتا تھا۔ اس کی حالت اس وقت کسی زندہ لاش سے کم نہ تھی۔

تکلیف کی شدت کے باوجود اس کی آنکھ لگ گئی۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد آنکھ اس وقت کھلی، جب اسے ان دونوں کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے دیکھا کہ وہ دونوں آگ جلائے بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں دو سلاخیں ہیں اور وہ انہیں آگ پر گرم کرنے میں مصروف ہیں۔ جب وہ سلاخیں خوب پک کر تیار ہو چکیں تو وہ دونوں قہقہے لگانے لگے۔

ان میں سے ایک نے دونوں سلاخیں اُٹھائیں اور زہریلی سی ہنسی کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔ اب اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ یہ سلاخیں اسے داغنے کے لیے تیار کی گئی ہیں۔ وہ بہت چیخا چلایا لیکن اس جنگل بیابان میں اس کی ان چیخوں کو سننے والا ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا اور وہ اس کی طرف دھیان دیئے بغیر اپنے کام میں مصروف تھے۔ اُن سلاخوں کا رخ اس کی دونوں آنکھوں کی طرف تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے سلاخیں اونچی کیں اور اس کی روشن آنکھوں کی طرف بڑھا دیا۔

ایک خطرناک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ ہڑ بڑا کر بستر سے اُٹھ بیٹھا۔

اُس نے تو ایک خوفناک خواب دیکھا تھا۔ وہ بے حد ڈرا ہوا تھا۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر اس کے امی ابو دوڑے ہوئے آئے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" اُس کے ابو نے سوال کیا۔

"لگتا ہے تم نے کوئی برا خواب دیکھا ہے"۔ اس کی امی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں!" اس نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ اس کی امی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد اس کی بے ترتیب دھڑکنوں کو قرار آگیا۔

"آپ ذرا آیت الکرسی پڑھ کر پھونک دیجئے"۔ اُس کی امی خود بھی آیتیں پڑھ کر دم کر رہی تھیں لیکن انہوں نے اپنے شوہر کو بھی اس کی مدد کے لیے شامل رکھنا چاہا۔

انہوں نے آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کر دیا۔ نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ چپلیں پہنیں اور کمرے سے باہر کی طرف لپکا۔

"کیا بات ہے بیٹا، کہاں چل دیئے!"

"امی بس دس منٹ میں آیا"۔

اس سے قبل کہ وہ اسے روکتے وہ دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔

"ارے باہر جایئے، اسے روکیے"۔ ان کی بیگم روہانسی ہو کر بولیں"۔ وہ نیند میں ہے، نہ جانے کہاں چلا جائے"۔

اس کے ابو بھی بوکھلاہٹ کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ محلے کی گلیوں کو پار کرتا ہوا ایک سنسان کھنڈر نما مکان میں پہنچا۔ اس کا دروازہ بھی ٹوٹا پڑا تھا۔ ایک عرصے سے یہاں کوئی رہائش پذیر بھی نہیں تھا۔ وہ دروازہ پھلانگ کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا کر عقبی گیلری نما حصے میں پہنچا۔ یہاں ایک کتا بندھا ہوا تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ گلے کی رسی بری طرح کھینچ کر کھڑکی سے باندھی گئی تھی جب کہ اگلے ہاتھوں کو ایک ساتھ ملا کر باندھ دیا گیا تھا۔ پچھلی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی جبکہ دوسری ٹانگ کو بھی کھینچ کر دروازے کی کیل میں رسی سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کتے کی یہ حالت تھی کہ وہ وہاں سے بھونک کر خاموش ہو جاتا تھا۔ ایک تو اس علاقے سے لوگوں کا گزر کم ہوتا تھا دوسرا وہ اتنا اندر باندھا گیا تھا کہ اس کی آواز وہیں گھٹ کر رہ جاتی تھی۔

اس کی یہ عادت تھی کہ جانوروں کے ساتھ چھیڑ خانی کرتا، اُنہیں ستاتا اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر خوشی حاصل

کرتا تھا۔ دو روز قبل یہ کتا اس پر بھونکا تو اس کی رگ شرارت پھڑکی اور وہ اس کے گلے میں رسی ڈال کر کھینچتا گھسیٹتا اس مکان میں لے آیا۔ وہ سوائے بھونکنے کے اور کوئی احتجاج نہ کر سکا۔ اس نے اس کے پاؤں باندھ دیئے اور اس طرح سے جکڑ دیا کہ وہ وہاں سے راہ فرار بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔

آج کے خوفناک خواب نے اسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ معصوم اور بے زبان جانوروں پر ظلم کرنا کتنا قابل گرفت گناہ ہے۔ بھوکے پیاسے کتے کی رسیاں اس نے کھولیں تو اس نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور مکان سے باہر نکل گیا۔ وہ مکان سے باہر آیا تو اس پر سے منوں بوجھ اُتر چکا تھا۔ سامنے سے اس کے ابو آتے نظر آئے جبکہ محلے کی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ اس کے ابو نے پیار سے اُسے ساتھ لگایا، کچھ دیر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے اور پھر اُسے مسجد کی طرف لے کر چل دیئے۔

☆☆☆

مہکتی سوچیں

(مرسلہ: زنیرہ صدیقی، فیصل آباد)

☆ کسی کو جاہل نہ سمجھو۔ ہر کسی سے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ (بقراط)

☆ مجھے پھول اور ماں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں ایک جیسے خوبصورت ہیں۔ (نادر شاہ)

☆ آپ سیکھنا چاہیں تو آپ کی ہر غلطی آپ کو سبق دیتی ہے۔ (ارسطو)

☆ جب دوست مانگے تو کل کا سوال ہی نہیں! (ہربرٹ)

☆ پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے (پیری کارنل)

☆ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے مگر خود سچا دوست بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ (حکیم لقمان)

☆ انسان کو دشمن سے بھی ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے کہ پھر اُسے دوست بنانا ممکن نہ رہے۔ (خلیل جبران)

عید اور ایک یتیم بچہ

تاج انصاری

عید یہ کیسی آئی ہے
بہن نہ کوئی بھائی ہے
بچے کھیلیں خوشیوں سے
ساتھ مرے تنہائی ہے
پیڑ سے پتا ٹوٹا کیا
آنکھ مری بھر آئی ہے
کِھلے ہوئے ہیں سب چہرے
دل کی کلی مُرجھائی ہے
سپنے ٹوٹے ماضی کے
یاد یہ کیسی آئی ہے
کون مجھے اب عیدی دے
گھر میں اُداسی چھائی ہے
اب مجھ سے یہ کون کہے
نانی عیدی لائی ہے
آنکھ کا تارا میں بھی تھا
اب یہ سوچ پرائی ہے
دوست یتیم کو رکھنا تاؔج
سب سے بڑی بھلائی ہے

سائنس نگر

حسن ذکی کاظمی

آؤ کشتی لڑو!

قیصر نے علی کی خوشامد شروع کر دی "میرے پیارے بھائی مجھے گیٹ کے باہر تک پہنچا دو۔ وعدہ کرتا ہوں واپسی پر تمہاری لیے ٹافی لے کر آؤں گا"۔

علی نے بھنا کر کہا "قیصر بھائی آپ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہیں۔ آپ مجھ سے بڑے ہیں پھر بھی کتے سے اتنا ڈرتے ہیں۔ ابھی تو ہمیں پانچ چھ دن رہنا ہے۔ میں ہر وقت کہاں آپ کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ جایئے وہ کچھ نہیں کہے گا"۔

قیصر نے ناراض ہو کر کہا "تمہیں کیا معلوم وہ کچھ نہیں کہے گا؟ اگر اس نے میری ٹانگ دبوچ لی اور اپنے دانت اس میں گاڑ دیئے تو تمہیں پتا ہے کیا ہو گا؟"

علی نے اسے چڑانے کو کہا "ہاں ہاں معلوم ہے۔ بس یہی ہو گا نا کہ درجن بھر بڑے بڑے ٹیکے لگیں گے۔ تو کیا ہوا؟"

قیصر اس وقت علی سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا اس نے نرمی سے کہا: "خیر اب وہ درجن بھر ٹیکوں کا زمانہ تو گیا۔ لیکن بہرحال پریشانی اور تکلیف تو ہو گی۔ تو تم یہی چاہتے ہو کہ تمہارے بھائی کو....."

علی نے کتاب بند کرتے ہوئے قیصر کی بات کاٹی۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ چلئے آپ بھی کیا یاد کریں گے"۔

قیصر اور علی دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ قیصر علی سے کوئی ڈیڑھ دو سال بڑا ہو گا۔ دونوں سکول کی چھٹیوں میں ماموں کے ہاں پشاور آئے ہوئے تھے۔ ماموں کی کوٹھی کے ساتھ ہی کسی کرنل صاحب کی کوٹھی تھی جنہوں نے ایک خوف ناک کتا پال رکھا تھا۔ یہ کتا بندھا رہتا تھا لیکن اس کے بھونکنے سے ہی قیصر کی جان جاتی تھی۔ وہ یہی سوچتا تھا کہ اگر کسی وقت کھلا رہ گیا تو.....؟ جاتے وقت وہ علی کو ساتھ لے کر سڑک تک جاتا اور واپسی پر گھنٹی بجا کر پہلے کسی کو باہر بلا لیتا پھر آگے بڑھتا۔ کتا بھی ایسا تھا کہ ادھر ماموں کے گھر کا گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دیتی ادھر وہ بھونکنا شروع کر دیتا۔ گویا ماموں کے گھر کی رکھوالی بھی اس کے ذمے تھی۔

خیر خوفناک کتے سے ڈرنا تو ایسی کوئی غلط بات نہ تھی لیکن مشکل تو یہ تھی کہ قیصر گائے اور ایسے ہی دوسرے سیدھے سادھے جانوروں سے بھی ڈرتا تھا۔ قیصر اور علی ایک دفعہ اپنی زمینوں پر گئے۔ وہاں گائیں پلی ہوئی تھیں۔ علی کو گایوں اور خاص طور سے بچھڑوں میں بڑی دل چسپی تھی لیکن قیصر دور دور ہی رہتا تھا۔ علی جب بھی پاس بلاتا یہی جواب ملتا:

"بھائی جانور کا کیا بھروسا؟ کس وقت موڈ بگڑ جائے اور سینگ بھونک دے۔ یہ کھیل اچھا نہیں"۔

علی کہتا "قیصر بھائی! ان گایوں کے سینگ اتنے کہاں ہیں جو بھونک دیں گی؟ ذرا قریب تو آیئے"۔

قیصر بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا "میرا مشورہ ہے تم بھی دور آجاؤ۔ سینگ نہیں بھونکے گی تو ٹکر تو مار سکتی ہے"۔

علی اُس کے پیچھے پڑ جاتا "اچھا آیئے گھوڑے کی سواری کریں"۔ قیصر جواب میں زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہتا:

"مجھے گھوڑے کی دولتی کھانے کا شوق نہیں۔ اپنی ہڈی پسلی نہیں تڑوانا مجھے"۔

علی عاجز آکر کہتا "آخر وقت کیسے گذرے گا؟ آیئے مرغیوں سے ہی کھیلیں"۔

قیصر اس پر بھی تیار نہ ہوتا "ارے میاں! وہ دیکھا ہے ان دو مرغوں نے آپس میں لڑ لڑ کر کیا حال بنا دیا ہے ایک دوسرے کا۔ یقین جانو تمہیں بھی اسی طرح گنجا کر دیں گے"۔

ایک دن دونوں میں اسی طرح تکرار ہو رہی تھی کہ علی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "قیصر بھائی! کوئی ایسا جانور بھی ہے جس سے آپ نہیں ڈرتے؟"

قیصر نے بڑی آہستگی سے کہا "میرے بھائی میں ڈرتا نہیں۔ احتیاط برتتا ہوں اور تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ زندگی میں ہمیشہ محتاط رہو"۔

علی زور سے ہنسا اور بولا "میرا خیال ہے آپ تو ہر چیز سے ہی احتیاط برتتے ہیں' جانوروں سے' اندھیرے سے' کھیل کود سے' تیرنے سے یہاں تک کہ انسانوں سے بھی۔ اب مان لیجئے کہ یہ احتیاط نہیں ڈر ہے۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ آپ زندگی بھر"۔

قیصر نے بات کاٹی اور ذرا غصے سے بولا: "یار تم زیادہ فلسفہ نہ جھاڑو۔ اپنا لیکچر بند کرو۔ کوئی اور بات کرو اور ہاں تم نے یہ کیا کہا کہ میں انسانوں سے بھی ڈرتا ہوں۔ وہ کون سے انسان ہیں؟ میں تو صرف اپنے بزرگوں سے ڈرتا ہوں اور یہ کوئی بری بات نہیں"۔

علی نے مسکرا کر کہا "ہاں بزرگوں کا ادب اور ڈر تو اچھی بات ہے لیکن وہ....." پھر اس نے سر کھجایا اور مسکراہٹ پورے چہرے پر پھیل گئی "لیکن وہ..... میرا مطلب ہے ہاشم بھائی"۔

ہاشم کا نام سنتے ہی قیصر کچھ کھسیانا ہو گیا اور اس نے علی کو ڈانٹنے کی کوشش کی:

"بے کار باتیں نہ کرو۔ ہاشم کا اِس وقت کیا ذکر ہے؟ کون ڈرتا ہے ہاشم سے؟ میں؟ ہرگز نہیں۔ میں تو بس یہ لحاظ کر لیتا ہوں کہ بھائی جان کے دوست کا بھائی ہے ورنہ....."

علی نے قیصر کا موڈ ٹھیک کرنے کو کہا:

"یہ ہوئی نا بات۔ قیصر بھائی ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے نام کی لاج رکھ لیجئے۔ قیصر..... قیصر روم..... واہ واہ کیا رعب تھا کیا دبدبہ تھا۔ کیا سلطنت تھی۔ آپ نے تاریخ تو پڑھی ہو گی؟"

قیصر نے بھلا اتنی تاریخ کہاں پڑھی تھی۔ البتہ یہ سن رکھا تھا کہ رومی سلطنت کے حکمران سیزر کہلاتے تھے جنہیں ہم قیصر کہتے ہیں۔ بہرحال اُس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس نے پڑھا نہیں بلکہ سنا ہے۔ کہنے لگا:

"سب معلوم ہے یار۔ خیر چھوڑو یہ تاریخ وارخ کے چکر کو۔ آؤ لوڈو کھیلتے ہیں۔ لیکن دیکھو ہار جاؤ تو رونا نہیں اور نہ بے ایمانی کرنا"۔

علی نے محسوس کیا کہ قیصر روم کا لقب اور ان کے رعب دبدبے کی بات سن کر قیصر کا موڈ ٹھیک ہو گیا ہے اور ہاشم کا خیال دماغ سے نکل گیا ہے۔ پھر کہنے لگا:

"ارے قیصر بھائی چھوڑیئے لوڈو تو بچوں کا کھیل ہے۔ آیئے ایئرگن سے نشانہ لگاتے ہیں"۔

قیصر پھر سنجیدہ ہو کر بولا "تمہارے ساتھ تو مشکل یہ ہے کہ ٹھیک چلتے چلتے پٹڑی سے اتر جاتے ہو۔ ایک دم اب یہ ایئرگن کہاں سے یاد آگئی۔ میاں شریفوں کے کھیل کھیلا کرو۔ تمہیں بتایا تھا کہ یہ بندوق وندوق کا کھیل ٹھیک نہیں۔ کسی وقت بھی حادثہ ہو سکتا ہے"۔

علی نے قہقہہ لگایا اور بولا "ارے چھوڑیئے قیصر بھائی۔ ایئرگن نہ ہوئی توپ ہو گئی۔ لیجئے اب ایئرگن سے بھی ڈرنے لگے..... بندوق..... ہاہاہا..... حادثہ..... ہاہاہا"۔

قیصر کو غصہ آنے لگا "یہ کیا احمقوں کی طرح ہاہاہا کر رہے ہو۔ کھیلنا ہے تو سیدھی طرح لوڈو کھیلو ورنہ میں چلا سیر کرنے"۔

علی کو قیصر کے غصے پر اور بھی ہنسی آئی۔ کہنے لگا:

"اکیلے جائیں گے؟ اور وہ راستے والے کتے؟ نہیں نہیں..... میں اپنے بھائی کو ایسے خطرے میں نہیں کودنے دوں گا۔ چلئے لوڈو

کھیلتے ہیں۔ لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہیں ایک دن آپ ان لال ہری کالی پیلی گوٹوں سے بھی نہ ڈرنے لگیں"۔

قیصر کو بھی ہنسی آگئی اور دونوں کمرے میں بیٹھ کر لوڈو کھیلنے لگے۔ کھیل بہت اچھا جا رہا تھا کہ علی کو پھر شرارت سوجھی۔ کہنے لگا:

"قیصر بھائی! یہ جو ہاشم بھائی ہیں' لگتے تو آپ سے کمزور ہی ہیں۔ عمر میں بھی آپ کے برابر ہی ہوں گے۔ لیکن بھئی بڑا رعب میں رکھا ہوا ہے آپ کو....."

قیصر نے بات ٹالی "بھائی میاں تم کھیل پر دھیان دو غلط سلط چالیں چل رہے ہو۔ گولی مارو ہاشم کو"۔

علی زور سے ہنس کر بولا "اچھا گولی میں ماروں؟ کشتی وہ آپ سے لڑتے ہیں' پچھاڑتے آپ کو ہیں۔ چوٹ آپ کے لگتی ہے اور گولی میں ماروں انہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

قیصر کو ایک بار پھر غصہ آگیا۔ کہنے لگا "تمہیں تو زبان بھی نہیں آتی۔ گولی مارنے کا یہ مطلب تو نہیں اور ہاں آج یہ بار بار ہاشم کا کیوں ذکر کرتے جا رہے ہو؟ میرا موڈ خراب کر رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں بھائی جان کی دوستی کے لحاظ میں خاموش ہو جاتا ہوں ورنہ....."

علی نے بات ختم کرنے کو کہا: "ہاں ہاں قیصر بھائی مجھے پتا ہے۔ میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا آپ سے"۔

علی نے تو بات ختم کر دی لیکن اصل معاملہ یہ تھا کہ قیصر ہاشم سے کافی خوف زدہ رہتا تھا۔ ہاشم ورزش کرتا رہتا تھا اور اُسے کشتی لڑنے کا شوق تھا۔ وہ ہر چار پانچ دن بعد قیصر کے گھر آتا اور اسے اکیلا پا کر اس سے اصرار کرتا "آؤ مجھ سے کشتی لڑو"۔ کشتی سے قیصر کی جان جاتی تھی۔ وہ ٹالتا رہتا' چھپتا پھرتا لیکن ہاشم اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ مجبوراً اسے کشتی لڑنا پڑتی اور چند سکنڈ میں وہ زمین پر چت پڑا ہوتا۔ چوٹ الگ لگتی اور شرمندگی علیحدہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ وہ واقعی ہاشم سے ڈرنے لگا اور دعائیں کرتا کہ ہاشم اس کے گھر نہ آئے۔ یہ بات صرف علی کو معلوم تھی۔ قیصر کسی اور کو بتاتے ہوئے شرم محسوس کرتا تھا۔ ویسے بھی ہاشم نے یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر اس نے کسی کو بتایا تو وہ اس کی زور دار پٹائی کرے گا۔

علی قیصر سے مذاق تو کرتا رہتا تھا لیکن اسے اپنے خالہ زاد بھائی سے بہت ہمدردی بھی تھی اور محبت بھی۔ وہ دعا مانگتا تھا کہ کسی طرح قیصر کے دماغ سے یہ خوف نکل جائے۔ ادھر ہاشم اب قیصر کو زیادہ ہی تنگ کرنے لگا تھا۔ "آؤ کشتی لڑو" وہ اس رعب سے کہتا تھا جیسے اپنے آپ کو گاما یا بھولو پہلوان سمجھ رہا ہو۔ علی اسے قیصر سے یہ کہتے سنتا تو اس کا جی چاہتا کہ ہاشم کو زمین پر ایسا پٹخے کہ وہ گھنٹوں اُٹھ نہ سکے۔ "آؤ کشتی لڑو۔ آؤ کشتی لڑو۔ بڑا آیا کشتی لڑنے والا" وہ غصے سے منہ ہی منہ میں کہتا اور پھر ہاشم کے جانے کے بعد قیصر کو سمجھاتا۔ "قیصر بھائی! کسی دن تو ہمت

سے کام لیجیے۔ آپ یقین جانیے جس دن آپ نے دو گھونسے جڑ دیئے ہاشم بھائی زمین پر پڑے کراہ رہے ہوں گے۔ آپ ان سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں۔ ہمت تو کیجیے۔ یہ روز روز کا قصہ ختم ہو جائے گا"۔

قیصر کچھ جواب نہ دیتا۔ وہ تو ہاشم سے اس قدر ڈرا ہوا تھا کہ اس سے مقابلے کی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا اور وہ ہاشم کی مار سہتا رہا۔

ایک دن اچانک یہ فیصلہ ہوا کہ قیصر کو پڑھائی کے لیے اس کے چچا کے پاس کراچی بھیج دیا جائے کیوں کہ لاہور میں اس کی پڑھائی ٹھیک نہیں ہو رہی تھی اور امتحان کا نتیجہ اچھا نہیں آرہا تھا۔ علی کو معلوم ہوا تو اُسے بڑا افسوس ہوا۔ قیصر نہ صرف رشتے میں اس کا بھائی تھا بلکہ سب سے قریبی دوست بھی تھا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ شاید قیصر کی اسی میں بھلائی ہو۔ ہو سکتا ہے ہاشم سے دور رہ کر اس کا خوف کم ہو اور دماغ پر سے بوجھ ہٹ جائے۔ آخر قیصر کے امی ابو کو بھی تو بیٹے کی طرف سے فکر تھی کہ وہ روز بروز زیادہ ڈرپوک ہوتا جا رہا ہے۔ سوچتے سوچتے علی کی آنکھ لگ گئی اور اس نے خواب دیکھنا شروع کیا:

ایک بہت بڑا میدان ہے جس میں ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ میدان کے بیچ میں ایک اکھاڑا ہے جس میں لمبے چوڑے دو پہلوان کشتی لڑنے آئے ہیں۔ دونوں کے چہرے پر ماسک چڑھی ہوئی ہے لہٰذا انہیں پہچانا نہیں جا سکتا۔ کشتی شروع ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ان میں سے ایک پہلوان شیر بن گیا اور دوسرا چوہا۔ چوہا موقعہ پاتے ہی میدان سے بھاگ نکلا۔ خوب تالیاں بجیں' خوب نعرے لگے' خوب شور مچا اور شور سے ایک دم علی کی آنکھ کھل گئی علی کو سخت کوفت ہوئی۔ ایسے وقت آنکھ کھلی کہ پتا ہی نہ چل سکا کہ شیر کون تھا اور چوہا کون؟ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید نیند آجائے اور خواب پھر شروع ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ علی اُٹھ بیٹھا اس نے اپنا خواب کسی کو نہیں سنایا۔ قیصر کو بھی نہیں۔

ایک مہینا گزر گیا اور قیصر کی کراچی روانگی کا وقت آگیا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے علی جب اسے ائیرپورٹ پر خدا حافظ کہنے لگا تو اس نے جلدی جلدی چپکے چپکے اپنا خواب بھی سنا دیا اور پھر کہنے لگا: "قیصر بھائی مجھے یقین ہے کہ وہ شیر آپ تھے اور چوہا ہاشم بھائی" قیصر نے بڑی پھیکی مسکراہٹ اور کچھ شرمندگی سے کہا۔ "ہاں بس خواب کی حد تک۔ حقیقت تو کچھ اور ہے۔ اچھا اللہ حافظ"۔

چھے مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن خالہ نے علی کو بتایا کہ قیصر چھٹیوں میں آرہا ہے۔ علی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ ایک ایک دن گننے لگا۔ آخر وہ دن آن پہنچا۔ قیصر آیا تو علی سارے کام چھوڑ کر سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنے لگا۔ دونوں میں خوب باتیں ہوئیں۔ قیصر نے کراچی کے خوب قصے سنائے۔ یوں تو علی کئی بار کراچی جا چکا تھا لیکن قیصر سے کراچی کی باتیں اور رشتے داروں کے قصے سننے میں مزہ ہی اور تھا۔ دو تین دن خیریت سے گزرے تھے کہ ہاشم ملنے آیا۔ اس کے آتے ہی قیصر کچھ پریشان سا ہو گیا اور علی کو بھی فکر لگ گئی کہ اب مزہ خراب ہو گا۔ ہاشم اس فکر میں تھا کہ وہ اور قیصر اکیلے ہوں تو اسے کشتی کی دعوت دے اور قیصر یہ چاہ رہا تھا کہ ایسا موقعہ نہ آئے۔ لیکن آخر ہاشم کو موقعہ مل ہی گیا اور اس نے فوراً کہا "آؤ کشتی لڑو"۔

قیصر نے ٹالتے ہوئے کہا "آؤ بیٹھ کر باتیں کریں۔ مجھے کشتی لڑنا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی علی سے پوچھو میں وہاں کافی دن ہسپتال میں داخل رہا ہوں۔ طبیعت خراب تھی"۔

ہاشم نے اصرار کیا "چلو اب تو صحت ٹھیک ہے۔ آؤ کشتی لڑو۔ بعد میں کراچی کے قصے سنیں گے"۔

علی بیچ میں بول پڑا "ہاشم بھائی! کیا یہ ضروری ہے کہ آپ جب بھی آئیں کشتی لڑیں۔ کبھی تو تمیز سے....."

ہاشم نے بات کاٹ کر کہا "اچھا تو ہم بد تمیز ہیں؟ چمچے' تم چپکے بیٹھے رہو ورنہ میں تمہاری بھی دھنائی کر دوں گا"۔

قیصر اور علی دونوں خاموش ہو گئے۔ لیکن ہاشم نے پھر للکارا "بس دیر نہ کرو۔ آؤ کشتی لڑو ورنہ"۔

قیصر کچھ پریشان چپکا بیٹھا رہا تو ہاشم نے اس کی پٹائی کے لیے مکا ہوا میں لہرایا۔ ابھی ہاتھ قیصر کی طرف آنے ہی والا تھا کہ وہ اس تیزی سے اٹھا جیسے اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا ہو اور

پھر اچانک اس نے ہاشم کا ہاتھ اس زور سے موڑا کہ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "ہائے" ابھی ہاشم سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ قیصر نے ایک زور کا مکا اس کے منہ پر رسید کیا۔ ہاشم لڑکھڑایا اور قیصر کی آواز گونجی "آؤ کشتی لڑو" ہاشم پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر منہ سہلانے لگا اور حیرت سے علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کچھ دیر وہ بت بنا کھڑا رہا پھر ہاشم سے پوچھا: "ہاشم بھائی! چوٹ تو نہیں آئی؟"

ہاشم شرمندہ بھی تھا اور حیران بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب۔ چند سیکنڈ بعد اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل سمجھوں گا تم سے"۔

قیصر زور سے ہنستے ہوئے بولا "ہاشم میاں! اب تمہاری طبیعت روز ہی خراب رہے گی۔ میرا خیال ہے آج ہی فیصلہ ہو جائے اور تمہاری خوشی کی خاطر کشتی ہو ہی جائے۔ کیوں بھئی علی تمہارا کیا خیال ہے؟"

علی نے زور کا نعرہ مارا "آؤ بھیا کشتی لڑو" ہاشم نے حالات بگڑتے دیکھے تو جانے کے لیے کمرے کا دروازہ کھولا۔ قیصر نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور بولا "کہاں چلے؟"

ہاشم نے بڑی مشکل سے بازو چھڑایا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا "کل سمجھوں گا"۔

قیصر اور علی نے زور کا قہقہہ لگایا اور ایک ساتھ بولے: "کل کبھی نہ آئے گی"۔

دوسرے دن قیصر نے ہاشم کو فون کیا "پہلوان! کل آگئی۔ آؤ کشتی لڑو" ہاشم نے جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ علی کو تو ایک تفریح ہاتھ لگ گئی۔ وہ جب موقعہ ملتا ہاشم کو فون کر کے کہتا "آؤ پہلوان کشتی لڑو" پھر دونوں زور سے ہنستے اور فون بند ہو جاتا۔ تیسرے دن اچانک علی کو کچھ خیال آیا اور اس نے قیصر سے پوچھا "ارے قیصر بھائی! یہ تو بتایئے کہ ایک دم یہ اتنی جان اور اتنی ہمت کہاں سے آگئی"۔

قیصر نے جواب دیا "کیوں کیا پہلے ہمت اور جان کی کمی تھی؟ میں تو ہاشم کا لحاظ کرتا تھا ورنہ....."

علی نے بات کاٹی "ارے چھوڑیئے قیصر بھائی۔ اب کل آپ یہ کہیں گے کہ آپ کتوں، گایوں اور گھوڑوں کا بھی لحاظ کرتے تھے۔ سچی بات بتایئے" قیصر چڑ گیا "تم پھر پٹڑی سے اترنے لگے۔ یہ بھلا اس وقت جانوروں کا کیا قصہ لے بیٹھے۔ بے کار باتیں بہت کرنے لگے ہو"۔

علی بھی سنجیدہ ہو گیا "اچھا ٹھیک ہے۔ اب وہ مرزا صاحب کا کتا اُچھل اُچھل کر آئے تو مجھے نہ بلایئے گا۔ خود ہی نپٹئے گا اُس سے"۔

قیصر نے بھڑک کر کہا "ارے چھوڑو یار۔ گئے وہ دن جب ہم تمہیں مدد کے لیے بلاتے تھے"۔

علی نے مسکرا کر کہا "ارے واہ قیصر بھائی۔ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا؟ یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ دن گئے کیسے؟ یہ ہوا کیا؟"

قیصر نے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر منہ علی کے کان کے پاس لا کر آہستہ سے بولا "یار ابھی یہ راز ہے۔ ابو امی نے منع کیا ہے کہ کسی کو نہ بتانا۔ میں بتا تو دوں لیکن انہیں پتا چل گیا تو میں مارا جاؤں گا..... خیر تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ اکیسویں صدی کے شروع میں خلیوں، جین اور ڈی این اے کے بارے میں تحقیق زوروں پر تھی۔ بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔ میری سمجھ میں تو ذرا کم ہی آتا ہے اور تم تو خیر نرے بدھو ہو۔ بس سیدھی سی بات یہ سمجھ لو کہ 2002ء میں یعنی آج سے چھ سال پہلے امریکی سائنس دانوں نے ایک ہی جین یا مورثے کی دو قسموں کا پتا چلایا۔ ان میں سے ایک شورٹ کہلاتی ہے اور دوسری لونگ۔ انہیں معلوم ہوا کہ دماغ کے اس حصے میں جس کا تعلق خوف سے ہے اور جسے (AMYGDALA) کہتے ہیں، اگر اس خاص جین کی پہلی قسم یعنی شورٹ زیادہ ہو جائے تو انسان ڈرپوک بن جاتا ہے اور خوف زدہ رہتا ہے اور اگر دوسری قسم یعنی لونگ زیادہ ہو جائے تو خوف نکل جاتا ہے یا کم ہو جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا دنیا بھر میں اس جین کے بارے میں اور تحقیق کی گئی اور تجربہ گاہوں میں اس جین کی دوسری قسم کی مدد سے ایک ٹیکہ تیار ہوا یعنی لونگ قسم کی جین کا ٹیکہ۔ کئی سال اس پر تجربے ہوتے رہے۔ پچھلے دنوں ایک عرب ڈاکٹر، ڈاکٹر احمد مکی جو اس تحقیق میں آگے آگے تھے کراچی آئے۔ چچا جان ڈاکٹر حسن کے ذریعے ان سے ملے اور بڑی مشکل سے وہ میرے علاج کے لیے وقت نکال سکے اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ جانوروں اور اندھیرے وندھیرے سے ڈرنا تو کراچی میں ہی بہت کم ہو گیا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہاشم میاں بھی میرے قابو میں آجائیں گے۔ اسی لیے شروع میں ذرا جھجک رہا تھا"۔

علی بڑی حیرانی سے یہ کہانی سن رہا تھا۔ جیسے ہی قیصر نے بات ختم کی اس نے کہا: "چھوڑیئے قیصر بھائی یہ جین وین کے چکر۔ یہ سب میرے خواب کی تعبیر ہے۔ آپ کو شیر بنا دیا اور ہاشم بھائی کو چوہا"۔

قیصر چڑ کر بولا "ہونہہ..... خواب کی تعبیر ہے..... ارے میاں یہ سائنس کی باتیں ہیں سائنس کی تم نہیں سمجھو گے"۔

علی نے بھی نقلی غصے سے کہا "اچھا تو الٹی کر دوں خواب کی تعبیر شیر چوہا بن جائے اور چوہا شیر"۔

قیصر نے بے پرواہی سے کہا "ہونہہ..... جب ہی تو کہتا ہوں کہ تم سیدھے چلتے چلتے"۔

علی نے خوب اونچی آواز میں جملہ پورا کیا "اتر جاتے ہو پٹڑی سے"۔

قیصر زور سے ہنسا اور دونوں ہاشم کو فون کرنے لگے: "آؤ کشتی لڑو"۔

☆☆☆

دلچسپ اور عجیب حقیقت

لیجئے بچو! بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے حوالے سے ہم آپ کو ایک ایسی عجیب اور دلچسپ بات بتانا چاہتے ہیں جو ہم سب کے لیے خوشگوار حیرت کا باعث تو ہے ہی تاہم اس میں قدرت کی طرف سے کار فرما حکمت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ..... تو جناب! حیران کن بات یہ ہے کہ یوم آزادی: 14 اگست، قائداعظمؒ کا یومِ پیدائش 25 دسمبر اور یومِ وفات 11 ستمبر ہر سال ایک ہی دن آتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1948ء میں تینوں تاریخیں ہفتہ کے دن، 1957ء میں بدھ کے دن، 1980ء میں جمعرات کے دن اور 2002ء میں یومِ آزادی اور قائداعظمؒ کا یومِ وفات دونوں بدھ کے روز آئے اور اب ان کا یومِ پیدائش 25 دسمبر 2002ء بھی بدھ ہی کے روز آرہا ہے۔ ہے نا عجیب بات!

شنازیہ نور

دُور دُنیا کا مرے دَم سے اندھیرا ہو جائے

یہ سچ تھا کہ حنا بہت ذہین لڑکی تھی اور ہمیشہ پہلی پوزیشن لیتی تھی۔ وہ تصویریں بھی بہت خوب صورت بناتی تھی۔ لیکن اس میں جو بہت بڑی برائی تھی وہ تھا غرور۔ وہ دوسروں کی کمزوریوں اور خامیوں کا مذاق اُڑانا اپنا حق سمجھتی تھی۔ جب کسی کالی لڑکی کو دیکھتی تو کہتی "لوڈ شیڈنگ نے بہت تنگ کیا ہو ہے" یا کہتی "افریقہ کے لوگ جانے کیوں یہاں آجاتے ہیں" کسی کی آنکھیں چھوٹی ہوتیں تو کہتی "یہ چِٹ بٹن کس دکان سے خریدے تھے؟" کسی کی ناک ذرا سی موٹی ہوتی تو کہتی "یہ آلو کا پکوڑا ہے یا بینگن کا" غرض اس کی ایسی ہی باتوں کی وجہ سے بہت سے لڑکیاں اُسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ یوں تو وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی مگر بقول اقبالؒ

"سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا

...... سو کچھ لڑکیوں نے خوشامد اور چاپلوسی سے اسے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ تاہم وہ سب گوری رنگ والی امیر مگر نالائق لڑکیاں تھیں۔ وہ امتحانوں کے دنوں میں ہر ممکن طریقہ سے حنا کے پرچے بھی نقل کرتیں تھیں مگر ان باتوں سے حنا کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ سب سے زیادہ خوبصورت اور ذہین لڑکی ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کی سہیلیاں بھی دوسری لڑکیوں کا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔

اب حنا نویں کلاس میں آگئی تھی۔ انہی دنوں کلاس میں ایک نئی لڑکی داخل ہوئی اس کا نام فریال تھا۔ فریال جس سکول سے آئی تھی وہاں وہ ہمیشہ پہلی پوزیشن میں کامیاب ہوتی تھی۔ وہ شکل و صورت کی بھی اچھی تھی۔ حنا پہلے تو فریال سے دور دور رہی مگر جب سہ ماہی امتحان میں دونوں نے ایک جیسے نمبر لیے اور کلاس میں اول رہیں تو حنا نے فریال کو دوست بنانے کا فیصلہ کیا مگر فریال اس وقت تک حنا اور اسماء کو دوست بنا چکی تھی اور حنا کی عادتوں سے بھی واقف ہو چکی تھی۔ فریال حنا سے یکسر مختلف ملنسار اور مددگار لڑکی تھی چنانچہ حنا جب بھی اس سے بات کرنا چاہتی وہ مختصر سی گفتگو

BY AHMAD SAJJAD

کر کے اپنی سہیلیوں کے پاس چلی جاتی۔ ایک دن فریال اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ حنا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور سلام کیا۔ فریال نے سر اُٹھا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور دوبارہ پڑھنے میں محو ہو گئی۔ حنا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ غصے سے چلا کر بولی: "آخر تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟ کہاں کی شہزادی ہو یا کوئی پری ہو.....؟

فریال نے کتاب بند کی اور بڑے تحمل سے بولی "میں نے کبھی شہزادی یا پری ہونے کا دعویٰ نہیں کیا"۔

حنا نے اپنا لہجہ دھیما کرتے ہوئے پوچھا "تو پھر تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی؟"

"اگر تم کوئی سوال کرتی ہو تو میں اس کا جواب دے دیتی ہوں اور تم کیا چاہتی ہو؟" فریال نے کہا۔

"میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں" حنا بولی۔

فریال نے مسکرا کر فوراً جواب دیا۔ "لیکن میں تم سے دوستی نہیں کرنا چاہتی"۔

"آخر کیوں! اسماء اور حنا جیسی کالی کلوٹی لڑکیوں کو تو تم نے دوست بنا لیا ہے" حنا تلملا کر بولی۔

"تم کہاں کی حسین شہزادی یا حور پری ہو جو میں تم سے دوستی کروں" فریال نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ حنا نے اپنے متعلق ایسا جملہ پہلی بار سنا تھا وہ تو جل بھن کر رہ گئی اور پیر پٹختی ہوئی فریال کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔ فریال زیر لب مسکراتی رہی۔

حنا نے گھر آکر سب سے پہلے آئینہ دیکھا۔ اسے فریال کی بات یاد تھی۔ اس لیے ابھی بھی غصے سے اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اپنی شکل آئینے میں دیکھ کر وہ تو پریشان ہو گئی۔ وہ واقعی خوبصورت نہیں لگ رہی تھی۔ غصے اور پریشانی سے دانت بھینچتی وہ اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ اور خوب روئی۔ اگلے روز جلتی پر تیل اس وقت پڑا جب کلاس ٹیچر نے اعلان کیا کہ کلاس کی مانیٹر بننے کے لیے ووٹنگ ہو گی۔ پہلے تو ہمیشہ حنا ہی کلاس کی مانیٹر ہوتی تھی کیوں کہ وہ ہمیشہ پہلے نمبر پر رہتی تھی مگر اب چونکہ فریال اس کے برابر آکھڑی ہوئی تھی اس لیے ٹیچر نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کلاس میں ووٹ ڈلوائیں گی اور جس لڑکی کے ووٹ زیادہ ہونگے وہ کلاس کی مانیٹر بنے گی۔ کلاس کی زیادہ تر لڑکیاں حنا سے نالاں تھیں جبکہ فریال اپنی اچھی طبیعت کی وجہ سے سب کی ہر دل عزیز بن چکی تھی۔ وہ پڑھائی میں اور مالی طور پر بھی ہر ضرورت مند لڑکی کی مدد کیا کرتی تھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سوائے چار ووٹوں کے سارے کے سارے ووٹ فریال کو مل گئے۔ ایسی بے بسی تھی کہ حنا شرمندہ ہونے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

ایک دن جب حنا سکول آئی تو وہ اپنے ساتھ اپنی بنائی ہوئی تصویریں بھی لائی تھی۔ وہ فریال کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرنا چاہتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کو تصویریں دکھانے اور داد وصول کرنے کے بعد وہ فریال، حنا اور اسماء کے پاس آگئی "یہ دیکھو، یہ تصویریں میں نے بنائی ہیں" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ فریال سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "واہ! بہت خوبصورت تصویریں ہیں، بہت اچھی ڈرائنگ ہے تمہاری تو" اسماء اور حنا نے کہا۔ مگر جس کے منہ سے حنا تعریف سننا چاہتی تھی وہ بالکل خاموش تھی۔ آخر حنا کو خود ہی پوچھنا پڑا "کیوں فریال کیسی ہیں تصویریں؟"

"بوگس، بکواس..... یہ دیکھو یہ چڑیا کی چونچ ٹیڑھی ہے اور کشتی تو بالکل جوتا سی لگتی ہے۔ یہاں رنگ بھی صحیح نہیں لگائے....."

فریال کے بے لاگ تبصرے کو سن کر حنا کو بہت تکلیف ہوئی۔ فریال جن خامیوں کی نشاندہی کر رہی تھی وہ سچ مچ تصویروں میں موجود تھیں، اس لیے حنا کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ اپنی تصویریں لے کر وہ آنسو پیتی ہوئی اپنی سہیلیوں کے پاس آگئی لیکن سارا دن وہ خاموش خاموش رہی گھر آکر اس نے اچھی طرح کھانا بھی نہیں کھایا اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں بند روتی رہی۔ رات کو بھی اسے بھوک نہ لگی۔

صبح جب اس کی امی جان اسے جگانے کے لیے آئیں تو حنا بخار میں تپ رہی تھی "میری گڑیا تمہیں کیا ہوا؟" حنا کی امی گھبرا گئیں۔ حنا نے آنکھیں کھولیں تو ان کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ حنا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک کرنے کے بعد کہا "یہ عام بخار نہیں ہے یوں لگتا ہے کہ حنا بے بی کو کوئی صدمہ پہنچا ہے"۔

"صدمہ! میری بیٹی کو! کیا ہوا حنا' کیا ہوا؟" حنا کے امی ابو اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے پریشان ہو گئے۔ حنا "کچھ نہیں" کہتی ہوئی ٹال گئی۔

"اسے آرام کرنے دیں اور باقاعدگی سے دوا دیں' اگر پھر بھی شام تک بخار باقی رہے تو مجھے اطلاع کر دیجیے گا"۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

آج حنا سکول نہیں آئی تھی اس کے ابو اس کی بیماری کی عرضی دے گئے تھے۔

"حنا اچانک ہی بیمار ہو گئی ہے جانے کیا بات ہے؟" فریال فکر مند ہو کر حنا اور اسماء سے بولی۔

"ہونے دو ہمیں کیا! ہمیں تو آج سکول میں سکون ملے گا" حنا نے کہا اسماء نے اس کی بات کی تائید میں سر ہلایا۔

"نہیں ایسا نہیں کہتے۔ اگر ہم بھی بروں کے ساتھ برے بن جائیں تو ہم میں اور ان میں فرق کیا رہ جائے گا اور حنا تو یوں بھی بہت ذہین لڑکی ہے بس ذرا خود پسند ہے۔ اس کی خود پسندی اور غرور ختم کرنے کے لیے ہی میں نے اس کی تصویروں میں خامیاں نکالی تھیں"۔

چھٹی کے وقت فریال کے ابو لینے آئے تو فریال نے انہیں بتایا کہ وہ اپنی سہیلی کی عیادت کے لیے جا رہی ہے۔ فریال کے ابو بھی ان تینوں کے ساتھ ہو لیے۔

حنا کی امی حنا کو دوا دے رہی تھیں کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ حنا کے ابو آج دفتر سے جلدی واپس آگئے تھے۔ وہ دروازہ کھولنے گئے۔

"لو حنا دوا پی لو" امی نے کہا۔

"نہیں امی کڑوی ہے یہ" حنا بولی۔

اس سے پہلے کہ امی اصرار کرتیں حنا کے ابو کی آواز سنائی دی" دیکھو حنا بیٹی' کون آیا ہے؟" حنا اور امی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا' فریال' حنا اور سماء مسکراتی ہوئی اس کے پاس آگئیں' فریال کے ابو نے راستے میں کچھ پھل خریدے تھے وہ فریال نے حنا کے پاس میز پر رکھ دیئے۔ فریال کے ابو اور حنا کے ابو مہمان خانے میں بیٹھ گئے امی مہمانوں کی تواضع کے لیے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"کیسی ہو حنا؟" فریال نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں" حنا نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

"میں نے تمہاری تصویروں میں خامیاں نکالیں تو تمہیں دکھ ہوا نا! ذرا سوچو جب تم کسی اور کی بنائی ہوئی چیز کا مذاق اُڑاتی ہو تو اس کو دکھ نہیں ہوتا ہو گا؟"

"میں تو کسی کی بنائی ہوئی چیز کا مذاق نہیں اُڑاتی" حنا نے کہا۔

"جھوٹ' کیا تم اللہ کی بنائی ہوئی چیز کا مذاق نہیں اُڑاتی ہو؟"۔

"واقعی یہ تو سچ ہے" حنا نے دل میں سوچا اور شرمندگی سے گردن جھکا لی۔

"تمہیں میرے الفاظ سے دکھ ہوا نا: میں معافی چاہتی ہوں مگر میرے یہ الفاظ دراصل تمہارے لیے تریاق کے طور پر تھے تاکہ تمہارے غرور کا زہر ختم ہو جائے۔ غرور صرف اللہ کے لیے ہے۔ میری دوست! ہم تو ناچیز ہیں" فریال نے پیار سے سمجھایا۔ فریال کی باتیں سن کر اسے ایسا لگا جیسے اس کے ذہن کی کوئی بند کھڑکی کھل گئی ہو۔ وہ روہانسی ہو کر بولی "مجھے معاف کر دو....."

فریال' اسماء اور حنا نے باری باری حنا کو گلے لگایا۔ حنا کی امی چائے لے کر آئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ان کی بیٹی بغیر دوا کے بالکل ٹھیک ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر عجیب سی چمک بھی تھی۔

☆☆☆

حیران کن

سید شوکت اعجاز

تین فٹ اونچا بجلی کا بلب

جاپان میں بجلی کا ایک ایسا بلب ایجاد کیا گیا ہے جو گھروں میں استعمال ہونے والے عام کرنٹ سے روشن ہو سکتا ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ وہ عام بلب سے 47300 گنا زیادہ روشنی دیتا ہے۔

گھڑی یا پانی کا فوارہ

امریکا میں ایک ایسی گھڑی ایجاد کی گئی جو مقررہ وقت پر سوئے ہوئے آدمی پر پانی کی تیز پھوار گراتی جس سے وہ ہڑبڑا کر فوراً اٹھ جاتا۔

بیچارہ ڈوڈو!

یہ جانور 16ویں صدی میں بحرِ ہند کے جزیرے ماسکرین میں پایا جاتا تھا۔ یہ جانور اس قدر ڈرپوک تھا کہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملاحوں کا شکار ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک ہی صدی کے اندر اس کا وجود ختم ہو گیا۔

ریشم کا راز

ریشم بنانے کا طریقہ صرف چین کے لوگوں کو آتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تین ہزار سال تک یہ فن انہی چینی لوگوں تک محدود رہا اور اگر کبھی کوئی بدیسی یعنی غیر ملکی اجنبی اس راز تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

سب سے بڑا آلہ موسیقی

"آکٹوباسے" (OCTOBASSE)

19ویں صدی میں ایجاد کیا جانے والا عجیب و غریب ساز جس کی شکل وائلن کی طرح تھی لیکن اس کی اونچائی دس فٹ ہوتی تھی۔

ہاتھی والے

نیاز علی بھٹی

بچو! آج ہم آپ کو "ہاتھی والوں" کا قصہ سناتے ہیں۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ یہ واقعہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی ولادت کے سال اور پیدائش سے چند روز پیشتر پیش آیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کب دنیا میں تشریف لائے؟ شاباش بالکل ٹھیک! آپؐ کا یوم ولادت 12 ربیع الاول بروز سوموار بمطابق 20 اپریل 571ء ہے۔

اُن دنوں ملک یمن پر قبیلہ حمیر کا قبضہ تھا۔ یہ لوگ سورج کو پوجتے تھے۔ اُن کا آخری بادشاہ ذونواس تھا۔ جو بڑا ظالم تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے تقریباً 20 ہزار انسانوں کو جو اُس کے طریقے پر عبادت نہیں کرتے تھے آگ کی خندق میں دھکیل کر مروا دیا تھا۔ اس ظلم کے خلاف یمن کے کچھ لوگ چھپتے چھپاتے ملک شام کے بادشاہ کے دربار میں پہنچے۔ اُسے ذونواس کے ظلم کی داستانیں سنائیں اور مدد کی درخواست کی۔ شام کے بادشاہ نے اپنے کمانڈروں ارباط اور ابرہہ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ ذونواس کی سرکوبی کے لیے یمن بھیجا۔ ذونواس ملک چھوڑ کر بھاگ نکلا اور کہتے ہیں بعد میں دریا میں ڈوب گیا۔ شام کے کمانڈروں نے ملک یمن پر قبضہ کر لیا اور یوں لوگوں کو ذونواس کے ظلم سے نجات ملی۔

بچو! تاریخ گواہ ہے کہ طاقت اور ہوس کی جنگ کا نتیجہ ہمیشہ بربادی اور تباہی ہی ہوتا ہے۔ یہی یمن میں ہوا۔ کچھ عرصے بعد ارباط اور ابرہہ میں طاقت اور ہوس کی جنگ شروع ہو گئی۔ جس میں ارباط مارا گیا اور یوں ابرہہ یمن کا گورنر مقررہ ہوا۔ اب ابرہہ بہت خوش تھا۔ ملک میں خوشحالی تھی اور مکمل امن و امان بھی مگر اُسے یہ پسند نہ تھا کہ یمن کے عرب باشندے حج بیت اللہ اور طوافِ کعبہ کے لیے ہر سال مکہ جائیں۔ لہٰذا اُس نے سوچا کہ کیوں نہ یمن ہی میں ایک بڑی عبادت گاہ بنا دے تاکہ عرب لوگ حج بیت اللہ اور طوافِ کعبہ کے لیے مکہ ہی نہ جائیں۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس طرح ایک تو یمن کی دولت باہر نہیں جائے گی، دوسرے لوگ آہستہ آہستہ وہ اُس کے مذہب کی طرف رجوع کریں گے۔ اس نیت سے ابرہہ نے یمن کے شہر صنعا میں ایک بہت عالیشان گرجا گھر بنایا۔ جب یہ گرجا بن گیا تو ابرہہ نے اعلان کروا دیا کہ آئندہ کوئی شخص حج و طوافِ کعبہ کے لیے مکہ نہیں جائے گا بلکہ وہ اپنی عبادت اُس کے بنائے ہوئے عالیشان گرجا میں ادا کرے گا؟ مگر کوئی اُس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

اُس وقت گو ملک میں بت پرستی عام تھی مگر اس کے باوجود دین ابراہیم اور خانہ خدا کی عظمت عربوں کے دل میں پیوست تھی۔ لہٰذا ابرہہ کے اعلان پر سارے عرب قبائل میں غم

وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ عرب کسی گرجا گھر یا مذہبی مرکز کو بیت اللہ کے برابر نہ سمجھتے تھے اور اُس کو چھوڑ کر کوئی عرب کسی اور طرف جانے کو تیار نہ تھا۔

پھر یہ ہوا کہ ایک رات کسی نے جا کر ابرہہ کے عالیشان گرجے میں گندگی پھیلا دی اور اُسے آگ لگا دی۔ جب ابرہہ کو اس کا علم ہوا تو وہ غصّے سے پاگل ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ کام کسی عرب کا ہے۔ لہٰذا اُس نے عربوں سے بدلہ لینے کی ٹھانی اور اُس نے قسم کھائی کہ وہ خود بیت اللہ پر حملہ کرے گا اور خانہ خدا کو گرا دے گا۔

اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے ابرہہ نے بادشاہ سے اجازت اور مدد مانگی۔ جس نے بخوشی اسے اجازت دی اور اپنا خاص ہاتھی "محمود" اُس کی مدد کے لیے بھجوایا۔

اب ابرہہ ایک بڑا لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ "دیکھوں گا اب کون مجھے روکتا ہے بیت اللہ کو مسمار کرنے سے!" اُس نے اپنے آپ سے تکبرانہ انداز میں کہا۔ ملک عرب میں جب ابرہہ کے لشکر اور اُس کی نیت کی خبر پہنچی تو عربوں میں غم و غصہ اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ خاص کر اہل قریش میں جن کا ایمان اور عقیدہ تھا کہ اللہ کے ہاں بیت اللہ کی ایک خاص قدر و منزلت ہے۔ مگر عرب قبائل کیونکہ منظم نہ تھے۔ بلکہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اِس لیے وہ ابرہہ کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ لہٰذا کچھ قبائل تو ڈر کے مارے خود ہی مطیع ہو گئے اور کچھ خوف کی وجہ سے پہاڑوں میں جا چھپے اور یوں ابرہہ پیش قدمی کرتے ہوئے اپنے بڑے لشکر کے ساتھ مکہ سے باہر ایک مقام پر پہنچا۔ جہاں اُس کے لشکر نے اہل قریش کے کچھ اونٹوں پر قبضہ کر لیا۔ اِن اونٹوں میں کوئی دو سو کے قریب اونٹ نبی کریم ﷺ کے دادا محترم جناب عبدالمطلب کے بھی تھے۔

یہاں سے ابرہہ نے اپنا ایک ایلچی اہلِ قریش کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ صرف بیت اللہ کو مسمار کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اگر اہل قریش نے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تو اُس کا لشکر بھی انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور وہ بیت اللہ کو منہدم کر کے واپس چلا جائے گا۔ ایلچی جب جناب عبدالمطلب کے پاس پہنچا تو انہوں نے جواب دیا کہ اہل قریش بھی ابرہہ کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا وہ خراج لے لے اور خانہ خدا پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ مگر ابرہہ نہ مانا اور بضد رہا کہ وہ ضرور خانہ خدا کو منہدم کر کے جائے گا۔ اہل قریش نے اُسے سمجھایا کہ خداخود اپنے گھر کی حفاظت کرے گا بہتر ہے کہ وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ مگر وہ نہ مانا اور بیت اللہ پر چڑھائی کی تیاری شروع کی دی۔

خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے اُس نے ہاتھیوں کے لشکر کو سب سے آگے رکھا۔ ان ہاتھیوں میں شاہِ حبش کا بھیجا ہوا "محمود" نامی ہاتھی سب سے آگے تھا مگر خدا کی قدرت جب حملے

مزدلفہ کا وہ میدان جہاں ابرہہ کا لشکر ابابیلوں کی کنکریوں سے تہس نہس ہو گیا۔

کا حکم ملا تو یہ ہاتھی جہاں تھا وہیں کھڑا رہا اور اُس نے مکہ کی طرف ایک قدم تک نہ بڑھایا۔ یہ بات ابرہہ کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ اس کے بعد "محمود" جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ فیل بانوں نے اسے بڑا مارا مگر اس نے اٹھنے اور مکہ کی طرف جانے سے انکار کر دیا اور مار کھاتا رہا۔ آخر لشکر والوں نے جب اس کا رخ یمن کی طرف کیا اور چلنے کو کہا تو حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ یمن کے راستے پر بھاگنے لگا!

جب یہ لشکر مکہ کے قریب پہنچا تو اسی اثنا میں آسمان پر سبز اور زرد رنگ کے ننھے ننھے پرندوں کی جن کو ابابیل کہتے ہیں قطاریں ظاہر ہوئیں اور ابرہہ کے لشکر پر آکر چھا گئیں۔ یہ ننھے پرندے اپنی چونچوں اور پنجوں میں چنے یا مسور کے دانے کے برابر تین تین پتھر اٹھائے ہوئے تھے جو انہوں نے ابرہہ کے لشکر پر گرانے شروع کر دیئے۔ یہ پتھر جس پر گرتا وہ گولی کی طرح انسان اور ہاتھی کے بدن کو چیرتا ہوا گزرتا اور پلک بھر میں ہلاک کر دیتا۔ یہ دیکھ کر ابرہہ کا لشکر تتر بتر ہو گیا اور واپس یمن کو بھاگ کھڑا ہوا۔ اب اوپر کنکریاں اور نیچے بھگدڑ۔ لہٰذا مغرور ابرہہ کے لشکر کا چند منٹوں میں خاتمہ ہو گیا۔ ابرہہ کے جسم میں بھی زہر پھیل گیا۔ اس کے جسم کے گل سڑ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور یوں اس کی موت واقع ہوئی۔

کہتے ہیں کہ ابرہہ کے اتنے بڑے لشکر میں صرف "محمود" ہاتھی اور دو فیل بان بچے جو اندھے اور اپاہج ہو چکے تھے۔

تو بچو! یہ تھی ہاتھی والوں کی مختصر اور عبرتناک داستان۔ جس کا ذکر قرآن مجید کے تیسویں پارے کی سورۃ فیل میں بھی آیا ہے۔ اس سورت کا ترجمہ یوں ہے۔

"کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں سے کیا معاملہ کیا۔ ہم نے ان کا داؤ بالکل اُلٹ دیا اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دیئے۔ وہ ان پر کھنگر والی کنکریاں پھینکتے تھے۔ سو (اللہ نے) انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا"۔

شاباش چُوچُو!

معروف احمد چشتی

ایک مرغی کے دس چھوٹے چھوٹے ننھے منے سے چوزے تھے۔ ان کا رنگ پیلا تھا اور اتنے نرم تھے جیسے روئی کے گالے ہوں۔ مرغی صبح صبح اپنے چوزوں کو لے کر کھیتوں کی طرف نکل جاتی۔ وہ زمین میں سے کیڑے مکوڑے تلاش کر کے خود بھی کھاتی اور اپنے بچوں کو بھی کھلاتی۔ کیڑے مکوڑوں کے علاوہ گلی سڑی سبزیاں، پھل اور ان کے بیج بھی مرغی کے بچے بڑے شوق سے کھاتے۔

مرغی کے سب سے چھوٹے چوزے کا نام تھا چوچو۔ چوچو بڑا ہی سیانا اور خوب صورت چوزہ تھا۔ وہ اپنا ہر کام خود کرتا اور اپنے بہن بھائیوں کے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ اس لیے سب گھر والے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ چوچو کو بخار ہو گیا۔ وہ دانہ دنکا چگنے کے لیے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ باہر نہ جا سکا۔ اس کی امی نے اسے کہا کہ وہ ڈربے کے اندر آرام سے لیٹا رہے۔ سارے لوگ اس کے لیے خوراک لے آئیں گے۔ چوچو نے ایسا ہی کیا اور ڈربے کے اندر آرام کرتا رہا۔ دوپہر کو جب اُس کی امی اور بہن بھائی اس کے لیے کیڑے مکوڑے، روٹی کے ٹکڑے اور دوسری چیزیں لے کر آئے تو چوچو نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ مگر اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود تو سارا دن آرام سے لیٹا رہا جب کہ اس کی امی اور بہن بھائی اس کے لیے خوراک اکٹھی کرتے رہے۔ اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے تو اپنے بہن بھائیوں کے لیے کوئی کام نہیں کیا تھا مگر اس کے بہن بھائی اس کے لیے دھوپ میں خوراک جمع کر کے لے آئے۔

اگلے دن بھی چوچو کی طبیعت خراب رہی اور امی اس کو ڈربے میں آرام کرنے کی تاکید کر کے دوسرے بچوں کے ساتھ

باہر چلی گئیں۔ چوچو سوچ رہا تھا کہ آج پھر اس کے بہن بھائی اور امی اس کے لیے کھانا لے کر آئیں گے تو اسے شرمندگی محسوس ہو گی۔ وہ دوسروں کا محتاج نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ تو خود دوسروں کے کام آنا چاہتا تھا۔ "مجھے اپنے کام خود کرنے چاہیں یا پھر مجھے اپنی امی اور بہن بھائیوں کے کام بھی کرنے چاہیں"۔ چوچو نے اپنے آپ سے کہا۔

چوچو کی طبیعت خراب تھی مگر اسے فضول بیٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے سوچا "فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے کہ میں گھر کی صفائی کر دوں۔ اس طرح میں بھی اپنے بہن بھائیوں کے لیے کوئی کام کر سکوں گا اور مجھے شرمندگی بھی نہیں اٹھانا پڑے گی۔ امی بھی خوش ہوں گی"۔

یہ سوچ کر چوچو نے اپنے گھر کی صفائی کرنا شروع کر دی۔ اس نے تنکوں کو اکٹھا کر کے جھاڑو بنایا اور گھر کی صفائی کرنے لگا۔ جھاڑو دینے کے بعد وہ گھر کے سامنے والے چھوٹے سے تالاب سے ایک برتن میں پانی بھر لایا اور فرش پر چھڑک دیا۔ وہ خوش تھا کہ وہ کوئی کام تو کر رہا تھا۔ اتنا کام کرنے کے بعد وہ تھک سا گیا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

دوپہر جب اس کی امی اپنے دوسرے بچوں کو لے کر واپس آئیں تو حیران رہ گئیں۔ "ارے یہ ہمارا گھر اتنا خوب صورت کس نے بنا دیا"۔

"امی جی' میں نے صفائی کی ہے" چوچو نے جواب دیا۔

"کیا!! چوچو کیا تم نے اتنا ڈھیر سارا کام کیا ہے؟" چوچو کے بہن بھائی حیران ہو کر بولے "جی ہاں! میں نے"۔ چوچو نے فخر سے جواب دیا۔

"ارے واہ..... ہمارا چوچو تو بڑا سیانا ہو گیا ہے" چوچو کے بھائی نے خوش ہو کر کہا۔

"چوچو بھیا! تم بہت اچھے ہو"۔ چوچو کی بہن نے کہا۔

"شاباش میرے بچے تم بہت بہادر ہو۔ تم تو بخار سے بھی نہیں ڈرتے"۔ چوچو کی امی نے چوچو کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

چوچو اپنی تعریفیں سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ خوشی سے اسے بخار بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا اور اسے شرمندگی کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا تھا آخر اس نے بھی تو اپنے بہن بھائیوں کے لیے کام کیا تھا۔

مجرم کون؟

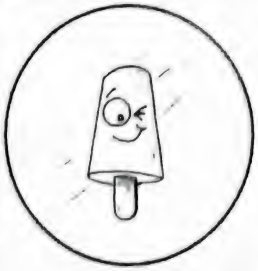

مجرم کا کھوج لگائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 10 دسمبر 2002ء

مجرم کون؟

نام: _____

پورا پتا: _____

_____

_____

جہاں سے بچہ گم ہوا تھا اس کے قریب ہی ایک آدمی آئس کریم کی ریڑھی لیے جارہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر "آئس کریم لے لو! آئس کریم لے لو!" کی آواز بھی لگائے جارہا تھا۔ انسپکٹر زاہد نے قریب جاکر آئس کریم دینے کو کہا تو اس نے جواب دیا کہ آئس کریم ختم ہوگئی ہے۔ اس کی اِس بات سے انسپکٹر کا شک یقین میں بدل گیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد انہوں نے بچہ برآمد کرلیا۔ ذرا بتایئے تو انسپکٹر کو کیونکر شک ہوا اور بچہ انہیں کہاں سے ملا؟

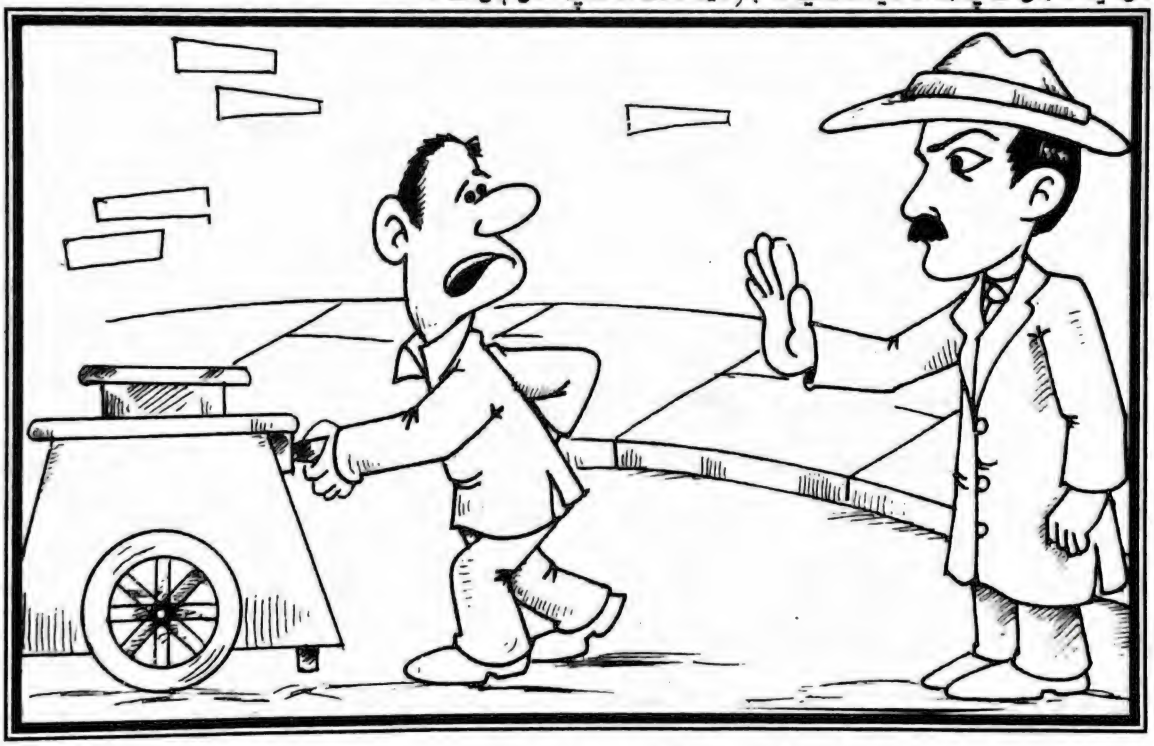

ستمبر 2002ء میں شائع ہونے والے "مجرم کون؟" کا صحیح حل: انسپکٹر زاہد نے کمال ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے میز پر پڑی شیشے کی بوتل کو میز پر مار کر توڑا اور پھر شیشے کے ٹکڑے سے رسی کو کاٹا۔ اس طرح وہ مجرموں کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ جواب ہمیں 1903 بچوں نے ارسال کیا' جن میں سے 10 بچے بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50' 50 روپے کی کتابیں دی جارہی ہیں۔

(1) وقاص مجید مظفر آباد آزاد کشمیر (2) حسان احمد سیالکوٹ (3) محمد انس خان کراچی (4) غفر ابلال کیانی نوشہرہ کینٹ (5) عاطف بشیر گوجرانوالہ (6) بلال طاہر لاہور (7) مریم صدیقہ ڈنڈوت (8) حسیب جمال خان مری (9) سمیعہ خالد جھنگ شہر (10) محمد عثمان شاہد قصور۔

بیس بال

کرکٹ امریکی طرز کی

سید شوکت اعجاز

آپ نے اکثر ٹیلی ویژن پر کچھ اس طرح کے کھیل کا منظر بھی دیکھا ہو گا کہ کھلاڑی ایک موٹی سی گیند پوری طاقت سے اپنے مخالف کھلاڑی کی طرف اچھالتا ہے اور دوسرا کھلاڑی کچھ فاصلے پر کھڑا ایک موٹا سا "دھوبیوں والا ڈنڈا" ہاتھ میں پکڑے گیند کو ضرب لگانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کی پشت پر ایک اور کھلاڑی ہاتھ پر بڑا سا دستانہ چڑھائے' سر پر ہیلمٹ پہنے اور جسم پر "زرہ بکتر" سجائے گیند پکڑنے کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے اِسی حلیے کا ایک اور آدمی نہایت چوکس انداز میں نظریں جمائے کھیل کا جائزہ لے رہا ہوتا ہے۔

جی ہاں! یہ بھی کرکٹ کی طرح کا ایک کھیل ہے جسے بیس بال کہا جاتا ہے۔ گیند پھینکنے والے کو PITCHER (یعنی باؤلر) اور ڈنڈا مارنے والے کو BATTER اور گیند پکڑنے والے کھلاڑی کو CATCHER کہتے ہیں۔ جب کہ اسی حلیے میں بالکل پیچھے کھڑا چوکس آدمی ریفری یا ایمپائر کے فرائض انجام دیتا ہے۔

بیس بال ریاستہائے امریکا کا قومی کھیل ہے۔ اس کھیل کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں کا کوئی بھی بچہ جس نے یہ کھیل نہ کھیلا ہو اپنی شخصیت کو نامکمل سمجھتا ہے گویا یہ کچھ ایسی ہی بات ہے جیسے یہاں محاورتاً کہا جاتا ہے کہ: "جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا"۔

ہمارے یہاں برصغیر میں جیسے گلیوں' کوچوں اور میدانوں میں چھوٹے بڑے سبھی فارغ اوقات میں کرکٹ کھیلتے نظر آتے ہیں بالکل اِسی طرح امریکیوں نے بھی اس دلچسپ کھیل کو اپنی روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ بنا رکھا ہے۔ یہاں تک کہ عام بول چال میں بھی اس کھیل کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے یہ کہنا ہو کہ: فلاں چیز تبدیل کر دو یا بدل دو تو بیس بال کا مخصوص لفظ PINCH HIT عام استعمال ہوتا ہے۔ اس کھیل کی بے شمار دوسری اصطلاحیں (TERMS) بھی عام طور پر روزمرہ گفتگو میں شامل ہیں۔ اس سے آپ بیس بال کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

یہ کھیل اب کئی دوسرے ممالک مثلاً کینیڈا' میکسیکو اور لاطینی امریکا کے ممالک میں بھی کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ فلپائن اور جاپان میں جہاں یہ کھیل تقریباً سو سال قبل متعارف ہوا تھا' اب اِن ممالک کی قومی شناخت بنتا جا رہا ہے۔

بیس بال کی طرح کا یعنی چھڑی اور گیند والا ایک کھیل صدیوں پہلے قدیم مصر میں کھیلا جاتا تھا تاہم تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ بیس بال کو نیویارک کے "ایبنر ڈبل ڈے" (ABNER DOUBLE DAY) نامی ایک شخص نے 1839ء میں باقاعدہ ایجاد کیا تھا۔ آغاز میں یہ کھیل راؤنڈر (ROUNDER) کی طرز کا تھا جو برطانوی لوگوں کی آمد سے متعارف ہوا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے امریکا میں یہ کھیل گلیوں کوچوں میں کھیلا جانے لگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شروع میں اسے TOWN BALL کا نام دیا گیا۔ ٹاؤن بال کا کھیل موجودہ بیس بال سے کافی مختلف تھا۔ لکڑی کے

تختے یا بھاری پتھر BASES کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے اور میدان چوکور یا بیضوی ہوتا تھا۔ کسی کھلاڑی کی کوئی خاص پوزیشن نہیں ہوتی تھی۔ میدان میں کسی کھلاڑی کو گیند ملتی تو وہ بھاگتے ہوئے کھلاڑی کو مارتا۔ اگر گیند اس کو لگ جاتی تو وہ آؤٹ ہو جاتا جسے اُس وقت PUGGING یا SOKKING کہا جاتا تھا۔ ابتدا میں دستانے بھی استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔

جس طرح باکسنگ کی تاریخ میں محمد علی کا نام' کرکٹ میں ڈان بریڈ مین' اسکواش میں پاکستان کے جہانگیر خان کا نام عالمی سطح پر جانا پہچانا جاتا ہے اسی طرح جارج ہرمین رُتھ (GEORGE HERMAN RUTH "BABE") بیس بال کی تاریخ کا عظیم کھلاڑی ہے۔ اس کھلاڑی کے کھیل کو دیکھنے کے لیے شائقین جوق در جوق چلے آتے تھے اور سٹیڈیم میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔

بیس بال دو ٹیموں کے مابین کھیلا جاتا ہے۔ ہر ٹیم میں 9 کھلاڑی ہوتے ہیں۔ اس کھیل میں کوئی ٹاس نہیں ہوتا بلکہ مہمان ٹیم ہی پہلے باری لیتی ہے۔ میدان DIAMOND SHAPE کا ہوتا ہے اور ہر کونے پر BASES بنے ہوتے ہیں۔ بلے باز (BATTER) جس نے ہاتھ میں ڈانڈا پکڑا ہوتا ہے وہ ایک چوکور ربر کے پاس کھڑا ہوتا ہے جسے پلیٹ PLATE کہتے ہیں۔

اس سے 20 گز کے فاصلے پر باؤلر (PITCHER) کھڑا ہوتا ہے۔ اِس جگہ کو MOUND کہتے ہیں۔ باؤلر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے کھڑے بلے باز کو اس طرح سے گیند پھینکے کہ وہ ضرب نہ لگا سکے لیکن شرط یہ ہے کہ بال کندھوں سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے نہ ہو۔ یوں اگر وہ بلے باز کو تین دفعہ ضرب نہ لگانے دے تو بلے باز آؤٹ قرار دیا جاتا ہے۔ بلے باز کوئی حفاظتی سامان استعمال نہیں کرتا جبکہ کرکٹ میں بلے باز پیڈ' چیسٹ گارڈ' دستانے اور ہیلمٹ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ تاہم بلے باز کی پشت میں جو CATCHER ' کرکٹ کے وکٹ کیپر کی طرح کھڑا ہوتا ہے وہ ایک بڑا حفاظتی دستانہ' ایک نقاب اور سینے اور ٹانگوں پر حفاظتی پیڈ استعمال کرتا ہے اور وہ باؤلر (PITCHER) کو اشاروں سے بتاتا ہے کہ اُسے کس طرح کی بال پھینکنی چاہیے۔آیا وہ SWERVER ہو' CURVER ہو یا پھر سیدھی ہو! بلے باز گیند کو پوری طاقت سے ضرب لگا کر اپنے BASE کی طرف بھاگتا ہے اور اس بیس پر کھڑا دوسرا کھلاڑی اگلے بیس پر جاتا ہے اور اس سے پہلا کھلاڑی اپنے اگلے بیس پر پہنچتا ہے۔ اننگز کا اختتام ان تین کھلاڑیوں کے آؤٹ ہونے پر ہوتا ہے۔ یوں ایک سرکٹ پورا کیا جاتا ہے یعنی ایک کھلاڑی ضرب لگا کر بھاگے اور اپنے اگلے بیس پر پہنچے جہاں سے دوسرا کھلاڑی اپنے اگلے بیس کی طرف بھاگتا ہے۔ اس طرح فیلڈر کی گیند واپس کرنے سے پہلے اپنے بیس پر پہنچ کر سرکٹ پورا کرنا ہوتا ہے جسے سکور یا رَن مانا جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کرکٹ کا کھلاڑی گیند کو شاٹ لگا کر وکٹوں کے درمیان بھاگ کر رنز بناتا ہے۔

بیس بال کے بارے میں ہماری پیش کردہ اِن معلومات کی روشنی میں اگر آپ کو بیس بال کا میچ یا ٹی وی چینل پر اس کی ریکارڈنگ دیکھنے کا موقع ملے تو یقیناً آپ نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ اِس شہرہ آفاق کھیل کو پسند بھی کریں گے۔

شرارتی لکیریں
شاہد ریاض شاہد
اب تو نلکے کے لیے بھی بین بجانی پڑے گی!
جھولا جھولائیں اپنے مُنّے کو ہم!
ہیلو...... مَیں لکشمی چوک
سے بول رہا ہوں۔
بجلی کی بار بار
خرابی سے
بچاؤ کا ایک طریقہ

ایک گدھا کسی مکان کے باہر کھڑا تھا۔ ایک دوسرے گدھے نے پوچھا یہاں کیوں کھڑے ہو۔ پہلا بولا میرا بچہ کھو گیا ہے۔ دوسرے نے کہا تو پھر ڈھونڈو اُسے' یہاں کیوں کھڑے ہو؟ پہلے گدھے نے جواب دیا: "اندر دو آدمی لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو گدھے کا بچہ کہہ رہے ہیں۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ان میں سے کون سچّا ہے"۔ (محمد عرفان' ساہیوال)

ایک آدمی دوسرے سے: "ہمارے گاؤں میں کھدائی کے دوران ٹیلی فون کے تار ملے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں میں ٹیلی فون ایک ہزار سال پہلے بھی تھا"۔

دوسرے نے کہا: تم ٹیلی فون کی بات کرتے ہو ہمارے گاؤں میں ہزار سال پہلے وائرلیس سسٹم بھی تھا۔

پہلا آدمی: وہ کیسے؟

دوسرا آدمی: وہ اس طرح کہ ہمیں کھدائی کے دوران کوئی تار نہیں ملا۔ (ملک محمد سجاد میانوالی)

ایک دوست دوسرے سے: "تمہیں معلوم ہے میرے ابو جادوگر ہیں"۔

دوسرا: "اچھا واقعی' وہ کیا جادو دکھاتے ہیں؟"

پہلا دوست: "جونہی وہ جوتا اٹھاتے ہیں میں وہاں سے غائب ہو جاتا ہوں"۔ (کوثر بانو' کراچی)

ایک شخص اپنا ہارمونیم فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دوست نے خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا: "میں اس کے زیادہ سے زیادہ سو روپے دے سکتا ہوں"۔

"تم نے بہت کم قیمت لگائی ہے۔ اس سے زیادہ تو میرا پڑوسی دے رہا ہے"۔ وہ شخص بولا: "کتنے دے رہا ہے؟" اس کے دوست نے پوچھا۔ "تین سو روپے۔ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ ہارمونیم بے شک اپنے پاس رکھو لیکن اللہ کے لیے اسے بجایا نہ کرو"۔ پہلے شخص نے جواب دیا۔ (مدیحہ اصغر خان' صادق آباد)

کنجوس مالک (ملازم سے): بتاؤ وہ کونسی چیز ہے جو محنت کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی؟

ملازم' (معصومیت سے): جناب میری تنخواہ۔

(محمد کامران' پنڈ دادن خان)

ایک بڑے شہر میں ٹریفک کانسٹیبل ایک شخص کو سڑک پر چت لیٹا دیکھ کر اس کے قریب گیا اور بولا: "کیا تمہاری طبیعت خراب ہے؟"

وہ شخص بولا: "نہیں جناب پارکنگ کے لیے جگہ کم ہی ملتی ہے' بیوی کو بھیجا ہے تاکہ گاڑی لے آئے میں یہاں جگہ گھیرے ہوئے ہوں"۔

(شیخ عمیر جاوید' بھلوال)

ایک جیل میں تین قیدی تھے۔ ان میں سے ہر ایک یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ جیل کا سب سے پرانا قیدی ہے۔ ایک قیدی نے کہا "میں یہاں اس وقت آیا تھا جب ابھی ریل بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی"۔

دوسرے نے کہا "جب میں یہاں آیا تھا تو لوگ گھوڑوں پر سفر کرتے تھے"

تیسرا قیدی بڑی معصومیت سے بولا: "بھئی یہ گھوڑے کیا ہوتے ہیں"۔ (جمشید محی الدین' خوشاب)

آؤ دیا جلائیں

آؤ دیا جلائیں پیارے
آؤ دیا جلائیں

تاریکی اب دور کریں ہم
دنیا کو پرنور کریں ہم
روشنی اب پھیلائیں پیارے
آؤ دیا جلائیں

ہر اک گھر کے صحن میں پیارے
بیج خوشی کے بوئیں سارے
سورج چاند اگائیں پیارے
آؤ دیا جلائیں

ٹیڑھی ترچھی راہوں میں اب
ساری ظلمت گاہوں میں اب
کرنیں خوب لٹائیں پیارے
آؤ دیا لائیں

اپنے اِس سُندر سے نگر کو
مِل جُل کر اب سارے گھر کو
خوشیوں سے چمکائیں پیارے
آؤ دیا جلائیں

عباس العزم

ظلمت گاہ: اندھیری تاریک جگہ سُندر: خوبصورت پیارا نگر: بستی شہر

سُنی سُنائی

زبیدہ سلطانہ

سُرخ چھتری

ظفر کی دکان کے سامنے ہی ایک درمیانے درجے کا اچھا ہوٹل تھا۔ وہ حسبِ معمول دوپہر کا کھانا کھانے گیا۔ واپسی پر اپنی چھتری اُٹھانے کو ہاتھ بڑھایا تو وہاں کونے میں اس کی اپنی چھتری کی بجائے' سرخ رنگ کی ایک قیمتی چھتری پڑی دیکھی جس کے سنہری دستے میں ایک پیارے سے گول مٹول بچے کی تصویر جڑی ہوئی تھی۔ ظفر اس پیاری سی تصویر کو دیکھتا رہ گیا۔ بچہ غنچہ سا منہ کھولے ہنس رہا تھا۔ سامنے کے چار دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں معصوم مسکراہٹ سے بھری ہوئی تھیں۔ ظفر کے اپنے ہونٹوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ ابھری۔ "کیسا پیارا بچہ ہے!" وہ بے ساختہ کہہ اُٹھا۔

ظفر نے سمجھ لیا تھا کہ کوئی غلطی سے اس کی چھتری اُٹھا لے گیا ہے اور اپنی چھوڑ گیا ہے۔ اب سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ وہ یہی چھتری لے جاتا۔ دکان پر پہنچ کر اس نے چھتری کو مقررہ جگہ پر رکھ دیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ گاہک آتے جاتے رہے۔ شام کو جب ظفر دکان بند کر رہا تھا تو یکایک لاؤڈ سپیکر پر کوئی اعلان سنائی دیا۔ ایک ٹیکسی پر سارے بازار میں گشت کرتے ہوئے اعلان کیا جا رہا تھا:

"میاں زاہد حسین کی سرخ رنگ کی چھتری گم ہو گئی ہے' اس چھتری کے ہینڈل پر ان کے اکلوتے بچے کی تصویر لگی ہوئی ہے جو اب فوت ہو چکا ہے۔ میاں صاحب کو گم شدہ چھتری بے حد عزیز ہے۔ جو کوئی یہ چھتری ان تک پہنچائے گا وہ شکریے اور دلی دعاؤں کے علاوہ پانچ ہزار روپے انعام کا بھی مستحق ہو گا!"

یہ اعلان سن کر ظفر کا دل مارے خوشی کے اُچھلنے لگا۔ اُس نے ایک دم سوچا۔ "تو یہ میاں زاہد حسین تھے جو میری چھتری اٹھا لے گئے اور غلطی سے اپنی یہ قیمتی چھتری چھوڑ گئے اب میں کل صبح دکان پر آنے سے پہلے ان کے بنگلے پر چھتری پہنچانے جاؤں گا۔ واہ ری قسمت مفت میں پانچ ہزار روپے مل جائیں گے۔ بے شک! اس کو کہتے ہیں خوش نصیبی!" یہ سوچ کر وہ اس طرف بڑھا جہاں چھتری ہوٹل سے واپس آکر رکھی تھی۔ مگر..... یہ کیا..... وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خالی کونے کو گھورنے لگا۔ اسی کونے میں تو اُس نے رکھی تھی۔ اس کا یقین ہوتے ہوئے بھی اُس نے دکان کا کونا کونا چھان مارا مگر چھتری کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ یقناً کوئی بدنیت گاہک' اس چھتری کا غیر معمولی رنگ دیکھ کر ایمان قائم نہ رکھ سکا اور چوری جیسے قابل نفرت فعل کا مرتکب ہو گیا!

"لعنت ہے اُس بے ایمان پر!" ظفر نے اُس نامعلوم چور کو بیسیوں گالیاں اور لعنتیں بھیج ڈالیں۔ مگر اب صبر کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ کڑھتا اور ہاتھ آئے پانچ ہزار روپے سے محروم رہ جانے پر افسوس کرتا گھر واپس آگیا۔

دراصل ظفر کا وہ گاہک چھتری کو چوری کی غرض سے نہیں لے گیا تھا بلکہ اُسے بارش سے بچنے کے لیے مسجد تک جانا تھا۔ اُس نے سوچا ظفر تو گاہکوں میں مصروف ہے وہ نماز پڑھ کر واپس آئے گا اور چھتری واپس رکھ جائے گا۔ وہ قریبی مسجد میں نماز ادا کر کے جب مسجد سے نکلا تو چھتری اُٹھانا بھول گیا۔ راستے میں اچانک خیال آیا تو دوڑا ہوا پھر مسجد میں پہنچا مگر وہاں اب چھتری موجود نہ تھی۔

سب سے آخر میں ایک آدمی نماز ادا کر کے اٹھا تو ایک خوبصورت سی چھتری لاوارث پڑی دیکھ کر اُٹھا لے گیا۔ اُس شخص نے کہیں دور جانا تھا۔ مسجد سے نکل کر اُس نے ٹیکسی کرایہ پر لی اور بیٹھ گیا۔ چھتری کو اُس نے اپنے قریب سیٹ پر رکھ لیا۔ اب اتفاق دیکھئے کہ منزل پر پہنچ کر وہ آدمی دوسری طرف کے دروازے سے اتر گیا۔ چھتری کا خیال ہی اُس کے ذہن سے اتر گیا جو اُس نے اپنے قریب سیٹ پر رکھی تھی۔

وہ اپنے گھر پہنچا تو یکایک سڑک پر سے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرتی ہوئی ٹیکسی گزری۔ اعلان سن کر وہ شخص دوڑا ہوا وہاں پہنچا جہاں ٹیکسی چھوڑی تھی۔ مگر وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ اُس کی یہ کوشش بے کار ہو گی۔ ٹیکسی وہیں کھڑی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ منہ لٹکائے واپس گھر جاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا "واہ ری قسمت! ہاتھ آئی دولت ذرا سی کوتاہی سے نکل گئی"۔ بھلا کوئی اُس سے پوچھتا کہ "بھلے آدمی! آخر تیرا اُس چھتری پر کیا حق تھا کہ جس کے ہاتھ سے نکل جانے پر تو اس قدر رنجیدہ ہو رہا ہے؟

اُدھر ظفر کے اس گاہک نے بھی اعلان سنا تو وہ بھی ہاتھ ملنے لگا اور اپنی بری قسمت کو کوسنے لگا..... "وہ کچھ اور ہی مقدر کے سکندر ہوتے ہیں جنہیں بیٹھے بٹھائے دولت ملتی ہے ہم جیسے بدنصیبوں کی ایسی قسمت کہاں؟" وہ یوں کڑھ رہا تھا جیسے اُس کے باپ دادا کا ورثہ تھا جس سے وہ محروم ہو گیا!

ان سارے مفت خوروں کو بھلا کیا معلوم کہ اللہ پاک اپنے نیک بندوں کی حلال کمائی کی خود حفاظت کرتے ہیں اور اسے رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ اب ہوا یہ کہ اتفاق سے اس روز میاں زاہد حسین کی گاڑی خراب تھی اور ڈرائیور اسے ورک شاپ میں مرمت کے واسطے لے گیا تھا۔ میاں زاہد حسین جو ایک ایماندار اور نیک خصلت تاجر تھے کرائے کی ٹیکسی لے کر اپنی دکان پر آئے۔ انہیں کسی کاروباری کام سے اسی علاقے میں جانا پڑا جہاں چوک میں ظفر کی دکان تھی۔ میاں زاہد حسین نے بھی دوپہر کا کھانا اُسی ہوٹل میں کھایا جہاں ظفر کھایا کرتا تھا۔ اُٹھے تو بے دھیانی میں ظفر کی چھتری اُٹھا لے گئے اور اپنی چھتری وہیں چھوڑ گئے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ چھتری پر نگاہ پڑی تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ واپس مڑے مگر چھتری موجود نہ تھی۔ بہت رنجیدہ ہوئے فوراً ڈھنڈورچی کو بلا کر شہر بھر میں پھر کر اعلان کرنے کا حکم دیا۔ یہ چھتری وہ کسی صورت کھونے کو برداشت نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس کے سنہری دستے میں انہوں نے اپنے اکلوتے مرحوم بیٹے کی پیاری سی تصویر جڑوا رکھی تھی جو بہت چھوٹی عمر میں فوت ہو گیا تھا' اس کے بعد میاں زاہد حسین کے گھر پھر کوئی چراغ نہ جل سکا تھا' یعنی پھر کوئی اُولاد نہ ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک یہی تصویر تھی۔

اب عجیب بات سنیے کہ شام کو جب میاں زاہد حسین گھر جانے کے لیے نکلے تو وہی ٹیکسی اُن کے سامنے سے گزری جو مسجد سے اُس نمازی کو لائی تھی۔ جوں ہی وہ دروازہ کھول کر بیٹھے۔ دیکھا تو اُن کی چھتری سیٹ پر پڑی تھی۔ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی انہوں نے ٹیکسی والے کو بہت انعام دیا حالانکہ ٹیکسی ڈرائیور کو تو علم ہی نہ تھا کہ وہ قیمتی چھتری جس پر انعام کا اعلان ہو رہا ہے اُس کی گاڑی میں پڑی ہے۔ میاں صاحب اپنی چھتری اور ڈرائیور انعام لے کر خوش خوش اپنے گھر گئے۔

☆☆☆

صحت کی حفاظت

اپنی غذا پر نظر رکھیے!

سید جاوید امتیازی

دیکھا جائے تو انسان کو جب کبھی بیماری کا سامنا ہوتا ہے تو پھر اُسے حقیقی معنوں میں صحت و تندرستی کی قدر کا پتا چلتا ہے۔ بلکہ ہسپتالوں میں مریضوں کا ہجوم خود ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ صحت کتنی انمول چیز ہے۔ ننھے ساتھیو! زندگی انسان کو ایک بار ہی ملتی ہے اور زندگی کی تمام تر نعمتیں' آسائشیں اور کامرانیاں اچھی صحت ہی کی مرہون منت ہیں۔ مگر ہمارے اندازے کے مطابق عملی طور پر کم لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ بہت سی بیماریاں غذا کی خرابی یا کمی بیشی کا نتیجہ ہیں۔ غذا سے مراد ہمارے نزدیک مرغن چٹ پٹے اور مسالے دار کھانے ہرگز نہیں۔ اچھی اور متوازن غذا سادہ خوراک ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔ متوازن غذا دراصل صحت کے لیے بہترین ٹانک ہے اور یقین مانیے! اس پر کوئی زیادہ خرچ بھی نہیں آتا۔

موجودہ دور میں جہاں انسانی زندگی میں پیدل چلنے یا ورزش کرنے کا معمول نہیں رہا وہاں مرغن چٹ پٹی اور تلی ہوئی چیزوں کا بے تحاشا استعمال موٹاپے کا باعث بنا ہے جو بذاتِ خود کسی بیماری سے کم نہیں! یہ چیزیں نہ صرف زیادہ چربی پیدا کرتی ہیں بلکہ معدے اور جگر کے نظام کو خاص طور پر متاثر کرتی ہیں۔ چربی کی زیادتی شریانوں اور دورانِ خون پر نہایت برا اثر ڈالتی ہے اور یہی چیز جو بلڈ پریشر کہلاتی ہے آگے چل کر دل کی خرابی کا باعث بھی بنتی ہے۔

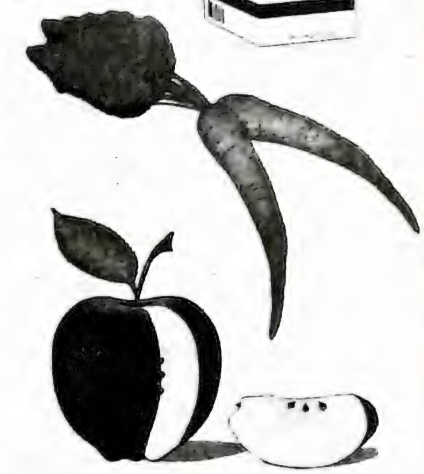

چنوں' منوں' ببلو' عائشہ! ہم آپ سب بچوں کو یہ باتیں اس لیے ذرا تفصیل سے بتا رہے ہیں تاکہ آپ ہر وقت اپنی خوراک اور غذا کا خیال رکھیں۔ اپنی خوراک متوازن رکھیں اور اعتدال کے ساتھ استعمال کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اگر میٹھا کھانے کا موڈ ہے تو میٹھی چیزیں ہی کھاتے چلے جائیں۔ اگر گوشت زیادہ پسند ہے تو ہر کھانے میں گوشت ہی کا استعمال کریں یا چاول اچھے لگتے ہیں تو ہر روز چاول ہی کھاتے رہیں۔ اس طرح کی لاپرواہی اور بے اعتدالی آپ کو مختلف بیماریوں سے دوچار کر سکتی ہے۔

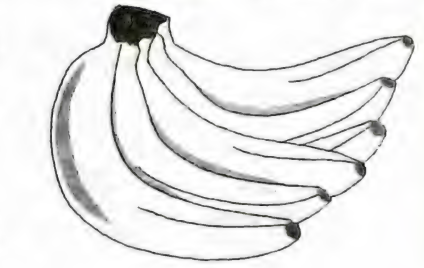

یاد رکھیے! غذا کے چار لازمی حصے ہیں۔ گھی' دودھ مکھن۔ پھل اور ترکاریاں۔ گوشت اور دال' اناج وغیرہ۔ ان سب چیزوں کا مناسب اور متوازن استعمال ہی اچھی صحت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ زیادہ مٹھاس اور چربی پیدا کرنے والی خوراک سے پرہیز کریں۔ طبی ماہرین غذا کے معاملے میں پھل' ترکاری اناج اور ریشے دار چیزوں کا مشورہ دیتے ہیں۔ قدرت نے بعض غذاؤں کے چھلکوں میں بڑے فوائد پوشیدہ رکھے ہیں اور اگر ہم انہیں چھلکے کے بغیر استعمال کریں تو لازمی طور پر اچھی غذا سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی طرح بعض سبزیوں کو کچا یا ہلکا ابال کر کھانا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ ہم آپ کو یہی تاکید کریں گے کہ اپنی غذا پر نظر رکھیے اور ہمیشہ صاف ستھری اور متوازن غذا استعمال کیجیے...... مگر اعتدال کے ساتھ!

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ بچوں سے بہت پیار کرتے تھے اور بچے بھی انہیں بہت چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ بچوں کو صرف اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کی معصومانہ باتیں دل کو خوش کرتی ہیں بلکہ وہ انہیں مستقبل کے معمار کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ ان کی ہمیشہ سے کوشش رہی کہ وہ انہیں پیار کریں اور اچھی اچھی باتیں بتائیں۔

ایک دفعہ آپ بازار سے ایک پُرجوش جلوس کی شکل میں گزر رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے لڑکے اور لڑکی نے انہیں چھت پر سے دیکھا اور اپنے محبوب رہنما کو پہچان لیا۔ یہ وہی چہرہ تھا جو وہ آئے دن اخباروں میں دیکھتے رہتے تھے۔ وہ دیکھتے ہی پوری طاقت سے چلائے:

"قائداعظم! قائداعظم"

قائداعظمؒ نے نظر اوپر اُٹھائی اور بچوں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا۔ دونوں بچوں کے دل مسرت سے لبریز ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں سنگترے پکڑے ہوئے تھے۔ چند لمحے انہوں نے سوچا اور ہاتھ لہرا کر وہ سنگترے قائداعظمؒ کی کار میں پھینک دیئے۔ قائداعظمؒ نے جھک کر وہ سنگترے اُٹھا لیے اور بچوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگے۔

آپ نے بچوں کے ان تحفوں کو پرے نہیں رکھ دیا بلکہ تمام سفر میں انہیں ہاتھوں میں تھامے رکھا۔

اسی طرح آپ ایک دفعہ کار میں سفر کرتے ہوئے گاؤں میں سے گزرے۔ بہت سے بچے اور دیہاتی ان کی کار کے پاس اکٹھے ہو گئے اور فضا "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ آپ کو وہاں پاکستان کے لیے روپوں کی ایک تھیلی اور پھولوں کا گلدستہ پیش کیا گیا۔ قائداعظمؒ نے دیکھا کہ ایک کم سن لڑکا زور زور سے نعرے لگا رہا ہے۔

آپ نے بچے کو بلایا اور پوچھا:

"میرے بچے پاکستان زندہ باد سے کیا مراد ہے؟ کیا تم جانتے ہو پاکستان کیا ہے!

"میں پاکستان کے متعلق اتنا کچھ تو نہیں جانتا جتنا آپ جانتے ہیں۔ لیکن ایک چیز مجھ پر واضح ہے کہ پاکستان کا مطلب ہے کہ مسلمان ان علاقوں پر حکومت کریں گے جہاں ان کی اکثریت ہے اور ہندو وہاں جہاں ان کی اکثریت ہے"۔ لڑکے نے جواب دیا"۔

قائداعظم بچے کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور اسے پیار سے تھپکی دی۔ بعد میں آپ اکثر اس واقعہ کو یاد کرتے رہے اور اکثر دوسرے لوگوں کو اس کی مثال بھی دیتے رہے۔

1940ء میں قائداعظمؒ دہلی سے لاہور تشریف لے جا رہے تھے۔ غازی آباد کے ریلوے سٹیشن پر گاڑی رکی اور قائداعظمؒ نیچے اُترے تو دیکھا کہ دس برس کا ایک بچہ پھولوں کا ہار لئے کھڑا

ہے۔ دوسرے استقبالیوں کو چھوڑ کر قائداعظمؒ از خود اس کی طرف بڑھے اور کافی جھک کر اسے اپنے گلے میں ہار ڈالنے کا موقع دیا۔ پھر آپ اُس سے پوچھنے لگے: بیٹا "تم کیوں آئے ہو؟"

بچے نے جواب دیا "آپ کو دیکھنے کے لیے؟"

قائداعظم نے پوچھا "تم مجھے کیوں دیکھنے آئے ہو؟"

بچہ بولا "قوم کے لیے"

قائداعظمؒ بچے کا یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ اب پاکستان ضرور بن کر رہے گا کیونکہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں بھی اپنی قوم کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

قائداعظمؒ کو نوجوانوں اور بچوں سے بہت اُمیدیں وابستہ تھیں اور ان پر انہیں بہت اعتماد بھی تھا۔ حصولِ پاکستان کی جنگ لڑنے کے لیے قائداعظمؒ نے نوجوانوں' خاص طور پر نوجوان طلبا ہی کو آگے بڑھایا۔ 1937ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن منظم کی۔ اس کا پہلا اجلاس قائداعظمؒ کی صدارت میں 1937ء میں کلکتہ میں ہوا۔ اس میں انہوں نے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"آپ لوگ تحریک پاکستان کا ہراول دستہ ہیں۔ آپ سے مجھے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ مجھے یقین ہے تم میں سے بہت سے جناح اُٹھیں گے۔ یقیناً مستقبل تمہارے ہاتھوں میں محفوظ ہے"۔

ایک روز کوئٹہ کے بازار میں بہت چہل پہل تھی۔ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ اچانک وہاں ایک لمبی سی کار آکر رکی اور اس میں سے ایک طویل قامت' دبلا پتلا اور باوقار شخص باہر نکلا۔ اس نے باہر نکل کر بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بازار کا جائزہ لیا اور کھلونوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔ اردگرد کے کچھ لوگوں کے ذہن میں اچانک اس باوقار شخص کا نام بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور وہ چلا اُٹھے:

"قائداعظم زندہ باد! قائدِاعظم زندہ باد!"

اس پکار کے ساتھ ہی دکان کے باہر لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اپنے محبوب رہنما کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہر شخص بے تاب تھا۔ انہیں حیرانی بھی تھی کہ وہ کھلونوں کی دکان میں کیا کر رہے ہیں۔ اب انہیں کیا خبر تھی کہ وہ جس گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا جو ہر وقت قائد کے قریب گھومتا رہتا تھا۔ وہ ان سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ قائداعظم اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر اکثر باتیں کیا کرتے تھے اور آج وہ اس کی خاطر کھلونے خریدنے آئے تھے۔

☆☆☆

احساسِ ندامت!

"میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا..... ایسی سڑک پر آنکلا جس پر ٹریفک نہیں تھی۔ مجھ سے تقریباً تیس گز آگے ایک کوریائی اپنے خیالوں میں مگن چلا جا رہا تھا۔ اُسے یکایک کھانسی ہوئی اور اس نے لاعلمی میں سڑک پر تھوک دیا۔ لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ اسے کسی اجنبی نے دیکھ لیا ہے تو مارے ندامت کے بھاگ گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کوئی تو خدا کی سرزمین کو آزادی سے استعمال کرتا نظر آیا۔ ہم نے آواز دی: میاں کس سے منہ چھپاتے ہو' ہمارے ہاں تو ایسی سڑکیں اللہ کے آزاد بندے بول پیشاب کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔ پان کی پچکاریاں' نسوار کے دھبے' کھنگ کھنگار سے تو ہم شاہراہوں کی زینت بڑھاتے ہیں۔ میری تیسری دنیا کے ساتھی! ٹھہر جا۔ دو منٹ مل بیٹھیں۔ مگر وہ بے چارہ شرم سے مارا ایسے غائب ہوا جیسے....." (محمد فاضل کیانی کے سفرنامے "چند دن کوریا میں" سے ایک دلچسپ اور قابل غور اقتباس)

ننھے ساتھیو! آپ کی معلومات کے لیے بتاتے چلیں کہ کوریا میں سر عام شاہراہوں پر تھوکنا نہ صرف معیوب بلکہ ایسا کرنا جرم خیال کیا جاتا ہے۔ اوپر دی گئی عبارت کو پھر ذرا غور سے پڑھیں اور ٹھنڈے دل سے سوچیں کیا ہم بھی جگہ جگہ تھوکتے رہنے کو برا خیال کرتے ہیں کہ نہیں؟ اس کوریائی باشندے کو کھانسی کے دوران تھوکنے پر جو ندامت ہوئی کیا آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟..... کاش ہمارے اندر بھی صفائی ستھرائی اور صحت عامہ کی اہمیت کا احساس جاگے! ایسی تو ہمارے دین اور پیارے نبی ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات کا تقاضا ہے۔

★ ★ ★ ★ ★

بڑا آدمی

احمد حسن رانجھا

پتلی سی پگڈنڈی پر چوہدری معراج دین اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ بائیں کندھے پر اس نے ایک تھیلا لٹکا رکھا تھا جس میں چند چھوٹی چھوٹی کتابیں تھیں جبکہ دائیں ہاتھ کو اس کے بیٹے نے تھام رکھا تھا۔ پگڈنڈی کے اردگرد دور تک سرسوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بہار کا سورج دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت لیے مشرقی افق پر چمک رہا تھا۔ آج ویسے بھی معراج دین بڑا خوش تھا۔ مسرت کے لڈو اُس کے من میں پھوٹ رہے تھے۔ پانچ برس پہلے اپنے بیٹے کی پیدائش پر جو سپنا اُس نے دیکھا تھا آج وہ پورا ہو چلا تھا۔ چوہدری معراج دین ایک ناخواندہ شخص تھا مگر اُسے اپنے بیٹے کو پڑھانے کا بے حد شوق تھا۔ اُسے تعلیم سے محبت تھی۔ معراج دین کا والد مقدمہ بازیوں میں پھنسا رہا تھا' جس کی وجہ سے اُن کے مالی حالات اتنے سازگار نہیں تھے کہ وہ تعلیمی اخراجات برداشت کر سکتے لہٰذا وہ تعلیم سے محروم رہا۔ اب اُس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ضرور دلوائے گا۔

"ابو!..... ابو! ہم کہاں جا رہے ہیں؟" معراج دین کے بیٹے کامران نے چلتے چلتے اچانک سوال کیا۔

"بیٹا! ..... ہم سکول جا رہے ہیں"۔ اُس کے والد نے شفقت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابو" یہ سکول کیا ہوتا ہے؟..... اور ہم کیوں سکول جا رہے ہیں؟....." کامران نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بیٹا! سکول وہ جگہ ہے جہاں لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جاتا ہے..... ہم سکول اس لیے جا رہے ہیں تاکہ تم سکول میں باقاعدہ داخلہ لے کر علم حاصل کر سکو!" معراج دین نے اُسے سمجھایا۔

"یہ علم کیا ہوتا ہے؟" کامران نے معصومیت سے پھر سوال کیا۔

"بیٹا! علم وہ دولت ہے جسے حاصل کر کے تم بڑے

آدمی بنو گے..... دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرو گے، جس سے میرا نام روشن ہو گا....."

"پھر تو میں ضرور یہ دولت حاصل کروں گا اور بڑا آدمی بن کے دکھاؤں گا"۔ کامران نے خوش ہو کر کہا۔

"بیٹا! ..... مجھے تم سے یہی اُمید ہے!" معراج دین نے فخر بھرے انداز میں اُس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

چلتے چلتے وہ دونوں اُس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے شہر کو جانے والی پکی سڑک صاف نظر آرہی تھی اور سڑک کی دوسری جانب درختوں کے جھنڈ میں چھپی سکول کی عمارت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ تیز تیز قدموں سے وہ آگے بڑھے اور سڑک پار کر کے سکول کے سیاہ رنگ کے آہنی گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے سکول کے وسیع و عریض صحن میں مختلف جماعتوں کے لڑکے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکٹھے بیٹھ کر اپنے اپنے اُستادوں سے پڑھنے میں مصروف تھے۔ صحن میں ہی مشرقی دیوار کے ساتھ، ایک بوسیدہ سی میز کے پیچھے بازوؤں والی کرسی پر بیٹھے، ایک ادھیڑ عمر شخص جس نے آنکھوں پر گول شیشوں والا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا، ایک رجسٹر کھولے لکھنے میں مصروف تھا۔

معراج دین کامران کا بازو پکڑے اُس کی طرف بڑھا اور قریب جا کر کہا:۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب!..... السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!..... کیا حال ہے معراج دین؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے چشمے کے اوپر سے گھورا اور پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا حال تو جی بالکل ٹھیک ہے!..... آپ اپنی سنائیں"۔ معراج دین نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو! میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بتاؤ آج کیسے ادھر آنا ہوا اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟" ماسٹر جی نے ہاتھ سے کامران کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا بیٹا ہے جی! اسے داخل کروانے کے لیے لایا ہوں"۔ معراج دین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ماشا اللہ! بڑا پیارا بچہ ہے۔ بیٹا! ادھر آؤ!" ماسٹر جی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کامران کو قریب بلایا۔ "بیٹا! ..... کیا نام ہے تمہارا؟....." انہوں نے پیار سے تھپکی دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی میرا نام کامران ہے!" اُس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"علم حاصل کرو گے نا بیٹا؟" انہوں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں ضرور علم حاصل کروں گا۔ علم حاصل کر کے بڑا آدمی بنوں گا اور اپنے ابو کا نام روشن کروں گا!....." کامران نے معصومانہ انداز میں بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

"معراج دین!..... اللہ تعالیٰ نے تمہیں بڑی اچھی اولاد سے نوازا ہے..... تمہارا لڑکا بہت لائق اور ذہین ثابت ہو گا اور ضرور بڑا آدمی بنے گا!" ..... ماسٹر جی نے ایک رجسٹر میں کامران کے نام اور کوائف کا اندراج کرتے ہوئے کہا۔

اب کامران روزانہ صبح سویرے اٹھتا منہ ہاتھ دھوتا، ناشتا کرتا اور بستہ جس میں اس کی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہوتی تھیں، اُسے کندھے پر ڈالے سکول روانہ ہو جاتا۔ زندگی میں اُس کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا علم حاصل کرنا۔ سارا دن وہ سکول میں پڑھتا اور رات کو دیر تک لالٹین جلائے سبق یاد کرتا رہتا۔ اُس کی آنکھیں ہر وقت بڑا آدمی بننے کا خواب دیکھتیں۔ جب بھی کبھی وہ پڑھائی سے اکتاتا تو اُس کے والد کا یہ فقرہ "علم وہ دولت ہے جسے حاصل کر کے تم بڑے آدمی بنو گے..... دنیا میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرو گے، جس سے میرا نام روشن ہو گا"۔ اُسے ایک نیا جوش اور ایک تازہ ولولہ عطا کر دیتا۔ آخر اُس کی محنت رنگ لاتی رہی اور وہ سکول میں ہمیشہ اول آتا رہا۔

کامران کا تعلیمی سفر نہایت شاندار انداز میں جاری رہا۔ دسویں کے امتحان میں اُس نے سکول کی تاریخ میں سب سے زیادہ نمبر لے کر ریکارڈ قائم کیا۔ گاؤں کا سکول چونکہ دسویں

جماعت تک تھا اس لیے دسویں کے بعد اُس کے والد نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اُسے شہر بھیج دیا۔

یہ ایک معمولی سا کمرہ تھا۔ کمرے کا داخلی دروازہ اس وقت بند تھا اور سامنے والی دیوار کے ساتھ چارپائیوں پر دو لڑکے کمبل اوڑھے سو رہے تھے۔ کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا جس سے صبح کے سورج کی کرنیں چھن چھن کر اندر آرہی تھیں اور کمرے میں دھیمی دھیمی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چارپائیوں کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر پڑے ٹائم پیس نے جیسے ہی سات بجائے الارم بج اٹھا۔ ساتھ والی چارپائی پر سوئے ہوئے لڑکے نے کمبل میں سے ہاتھ باہر نکالا اور الارم بند کر دیا۔ کمبل ایک طرف کر کے وہ اُٹھ بیٹھا۔ کافی دیر تک سویا رہا تھا اس لیے اُس کی حرکات میں تھوڑی سستی نظر آرہی تھی۔ چپلیں پہن کر وہ ساتھ والی چارپائی کی طرف بڑھا اور کمبل کھینچ کر مخاطب ہوا:

"کامران! ..... اُٹھ جاؤ..... بھئی سات بج گئے ہیں۔ نو بجے تو تمہارا انٹرویو ہے۔ دیر ہو جائے گی"۔ کامران نے آنکھیں کھولیں' سامنے دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ وہ لڑکا باتھ روم میں جا چکا تھا۔ وہ کامران کا دوست تھا۔ اُس کا نام فہیم تھا۔ کامران کی اور اُس کی دوستی کالج میں ہوئی تھی۔ ہاسٹل میں وہ دونوں اکٹھے رہے تھے۔ اکٹھے ہی وہ یونیورسٹی میں بھی پڑھتے رہے اور تعلیم سے فارغ ہو کر دونوں اکٹھے ہی کرائے کے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ وہ آج کل ملازمت کی تلاش میں تھے۔

باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ فہیم تولیے سے سر پونچھتے ہوئے باہر نکلا۔ کامران کی دوبارہ آنکھ لگ چکی تھی۔

"ارے بھئی! ..... اُٹھ بھی جاؤ" فہیم نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ کامران ہڑبڑا کر اٹھا اور پھرتی سے چپل پہن کر باتھ روم کی طرف لپکا۔

دیوار کے ساتھ لگے شیشے میں دیکھتے ہوئے وہ گیلے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا کہ فہیم کچن سے ناشتا تیار کر کے لے آیا۔ ناشتا کرنے کے بعد کامران اٹھا اور شیشے کے ساتھ والی الماری میں سے ایک فائل اٹھائی جس میں اس کی اسناد اور مختلف دستاویزات تھیں۔

"اچھا فہیم! میں چلتا ہوں..... انٹرویو میں دیر ہو رہی ہے..... میرے لیے دعا کرنا۔ اللہ کرے انٹرویو اچھا ہو جائے" یہ کہہ کر کامران رخصت ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں اتر گیا۔

بڑی سڑک پر اُسے ایک رکشا مل گیا اور پھر جلد ہی اُس دفتر پہنچ گیا جہاں آج اس کا انٹرویو تھا۔ سامنے ایک بڑے ہال میں صوفوں پر بیٹھے کئی امیدوار انٹرویو کے لیے اپنی باری آنے کے منتظر تھے۔

ہال کے داخلی دروازے کے سامنے والی دیوار میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ دروازہ کھلتا اور کوئی نہ کوئی اُمیدوار انٹرویو دے کر باہر نکلتا۔ دروازے پر کھڑا ایک آدمی جس کے ہاتھ میں اُمیدواروں کے ناموں کی فہرست تھی اگلے اُمیدوار کا نام پکارتا۔ آخر کامران کی باری بھی آ ہی گئی۔ وہ فائل ہاتھ میں پکڑے ہوئے اٹھا اور اپنے کپڑے درست کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ سامنے بہت بڑی میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ کامران نے جاتے ہی اُسے سلام کیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کو کہا۔ کامران آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی دستاویزات والی فائل اس کے سامنے رکھ دی۔

"ہاں! ..... تو برخوردار تمہاری تعلیمی قابلیت کیا ہے؟" اُس شخص نے فائل کھولتے ہوئے کہا۔

"سر! ..... میں نے معاشیات میں فرسٹ کلاس ایم اے کیا ہوا ہے اور گولڈ میڈل بھی حاصل کر چکا ہوں" کامران نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"یہاں کس لیے آئے ہو؟" اس شخص نے کامران کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر! ..... بے روزگار ہوں' ملازمت بہت تلاش کی

لیکن کہیں نہیں ملی۔ سرکاری ملازمت کے لیے بھی بہت دوڑ دھوپ کی۔ قابلیت ہونے کے باوجود میرے پاس رشوت کے لیے پیسے یا سفارش نہیں تھی اس لیے کہیں بھی مجھے ملازمت نہیں دی گئی۔ آپ کی کمپنی کا اشتہار دیکھ کر درخواست دی ہے۔ شاید آپ ملازمت دے دیں" کامران نے بیچارگی سے اپنی داستان سنائی اور اُمید بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کوئی سفارش ہے اب تمہارے پاس" کمپنی کے مالک نے ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"سفارش تو کوئی نہیں ہے سر!"

"پھر تمہیں یہاں بھی کوئی ملازمت نہیں مل سکتی۔ تم جا سکتے ہو"۔ کمپنی کے مالک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

کامران آہستگی سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے باہر آگیا۔ اب تو وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ یہ ملازمت اُس کی آخری امید تھی جو ختم ہو چکی تھی۔

کامران بس میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ بس پوری رفتار کے ساتھ ایک چھوٹی سی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ کامران کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں باہر کے مناظر پر لگی ہوئی تھیں لیکن ذہن کچھ اور ہی سوچوں میں گم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے جو اتنی تعلیم حاصل کی ہے اس کا کیا فائدہ ہوا؟ بچپن میں اُس نے بڑا آدمی بننے کے جو سپنے دیکھے تھے وہ سب آج بکھر چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ناکام انسان سمجھ رہا تھا۔ بڑی امیدیں اور اُمنگیں لے کر وہ شہر آیا تھا' لیکن آج خالی دامن واپس جا رہا تھا۔ کچھ بھی تو حاصل نہیں کر سکا تھا وہ! رہ رہ کر اسے اپنے بوڑھے باپ کا خیال ستا رہا تھا' جس نے اس کی پیدائش سے لے کر اب تک اس کے بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسے وہ اپنے بوڑھے باپ کا سامنا کرے گا۔ کیسے وہ اُسے بتائے گا کہ علم حاصل کرنے کے باوجود وہ آدمی جس کے پاس رشوت کے لیے پیسا نہیں ہے جو کسی کی سفارش نہیں لا سکتا وہ زندگی میں کوئی بھی مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ سوچ سوچ کر وہ پریشان اور شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو کیا بتائے گا۔ کیسے بتائے گا کہ وہ اُن کے خواب پورے نہیں کر سکا۔

"باؤ کامران !..... تمہارا گاؤں آگیا ہے ! کیا اترنا نہیں؟....." وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ بس رک گئی اور کنڈکٹر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

کامران بے دلی سے قدم اٹھاتا ہوا بس سے نیچے اتر آیا۔ بس روانہ ہو گئی۔ وہ گاؤں والے سکول کے سامنے کھڑا تھا۔ پشت پر وہ پگڈنڈی بھی تھی بچپن میں جس پر چلتے چلتے اُس کے دل میں اُمنگیں جاگتی اور اُمیدیں پروان چڑھتی تھیں کہ وہ اپنے باپ کے خوابوں کو پورا کرے گا۔ آج پھر اس کے قدم اُسی پگڈنڈی پہ اٹھ رہے تھے' لیکن اب اُس کے دل پر بوجھل احساس غالب تھا کہ اپنے باپ کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ مایوسی کے ساتھ چلتا ہوا انہی سوچوں میں گم' وہ اس کھیت کے قریب پہنچ گیا جہاں اُس کا باپ ہل چلا رہا تھا۔

معراج دین نے کامران کو دور سے آتے ہوئے دیکھا اور ہل چھوڑ کر بھاگا چلا آیا۔ کامران کو جا کر گلے لگا لیا۔ اُس کا

ماتھا چومتے ہوئے بولا:

"بیٹا! کیسے حال ہیں..... صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔ سفر تو اچھا گزرا نا!..... آج اتنے عرصے کے بعد دیکھ کر تمہیں' روح خوش ہو گئی ہے....."

"حال تو ٹھیک ہے..... ابا..... مجھے معاف کر دیں میں آپ کے خواب پورے نہیں کر سکا۔ میں وہ نہیں بن سکا جو آپ چاہتے تھے..... میں زندگی میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکا جس کی آپ کو توقع تھی۔ میں بڑا آدمی نہیں بن سکا۔ میں کچھ بھی نہیں بن سکا"..... کامران کی آواز بھرا گئی اور آنسو آنکھوں کے کناروں سے بہہ نکلے۔

"بہت افسوس ہوا مجھے یہ سن کر..... افسوس کہ تمہارے ذہن میں پڑھنے اور علم حاصل کرنے کے باوجود بڑے آدمی کا تصور کتنا غلط تھا؟ تم اُسے بڑا آدمی سمجھتے ہو جس کے پاس پیسا ہو' دولت ہو اور آسائش ہوں تمہارے نزدیک بڑائی کا معیار دولت ہے۔ کتنا غلط معیار چنا ہے تم نے۔ افسوس کہ تم نے پیسے کے حصول کے لیے محنت کی..... بڑا آدمی تو وہ ہے جس کا کردار بڑا ہے جس کا اخلاق بڑا ہے اور جس کی سوچ بڑی ہے۔ روزی رزاق تو خدا کی ذات ہے۔ جو رزق اُس نے کسی کے حصے میں لکھ دیا وہ تو اُسے مل کر رہے گا۔ میں خوش تھا کہ میرے بیٹے نے علم حاصل کیا ہے' اُس کا کردار اچھا ہے' اُس کا اخلاق اچھا ہے اور اُس کی سوچ اعلیٰ ہے۔ میں فخر کرتا تھا ان باتوں پر اور میں سمجھتا تھا کہ تم نے میرے خوابوں کو پورا کر دیا..... لیکن میں پشیمان ہوں کہ تمہارے نزدیک تو بڑائی کا وہ معیار ہی نہیں' جو میں سمجھتا تھا۔ تم نے تو تعلیم صرف اچھی ملازمت کے لیے حاصل کی۔ تم نے اُن اچھائیوں کو کوئی اہمیت نہ دی جو تعلیم نے تمہاری ذات کو دی تھی..... تم اگر اپنے علم اور اچھی سوچ کے ساتھ آکر میرا ہاتھ تھامتے اور میرے ساتھ مل کر اس زمین کے سینے میں ہل چلاتے تو خدا تمہارے حصے کا رزق اس زمین کے ذریعے تمہارے حوالے کر دیتا۔ تم علم کے بل بوتے پر اس سونے جیسی مٹی سے کیا کیا کچھ نہیں حاصل کر سکتے۔ تمہیں خدا پہ بھروسہ کرتے ہوئے اپنے علم کی مدد سے اپنی مٹی کو سنوارنا چاہیے تھا..... اس زمین کے سینے سے اُگنے والی اچھی اچھی فصلیں تمہاری بڑائی کی گواہی دیتیں۔ تم تو واقعی کچھ بھی نہیں بن سکے!" معراج دین جذبات میں پتا نہیں کیا کیا کچھ کہہ گیا۔

کامران بغور اپنے والد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ پڑھنے کے باوجود اُس کا باپ کتنا عظیم ہے۔ کتنا بڑا آدمی ہے۔ اُس کی سوچیں کتنی بلند ہیں۔ اُسے اپنے خیالات بہت پست نظر آنے لگے۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بڑا آدمی بن کے دکھائے گا۔

پگڈنڈی سے اتر کر کھیتوں میں سے ہوتا ہوا وہ اپنے کھلیان تک پہنچا۔ بیلوں کی جوڑی جس کی مدد سے اُس کا باپ ہل چلا رہا تھا' اُس کی منتظر کھڑی تھی۔ اُس نے بیلوں کی رسی تھامی اور چھڑی کی مدد سے انہیں ہانکنا شروع کر دیا۔ ہل زمین کے سینے کو چیر رہے تھے اور اندر سے سرخ سرخ گیلی مٹی باہر نکل رہی تھی۔ وہ بغور اُس مٹی کو دیکھ رہا تھا اور اُس مٹی میں اسے اپنا بڑا آدمی بننے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آرہا تھا۔

نگہ بلند' سخن دل نواز' جاں پرسوز

بانیٔ پاکستان

قائداعظم محمد علی جناحؒ

آپ معلومات کی روشنی میں

وجیہہ طاہر

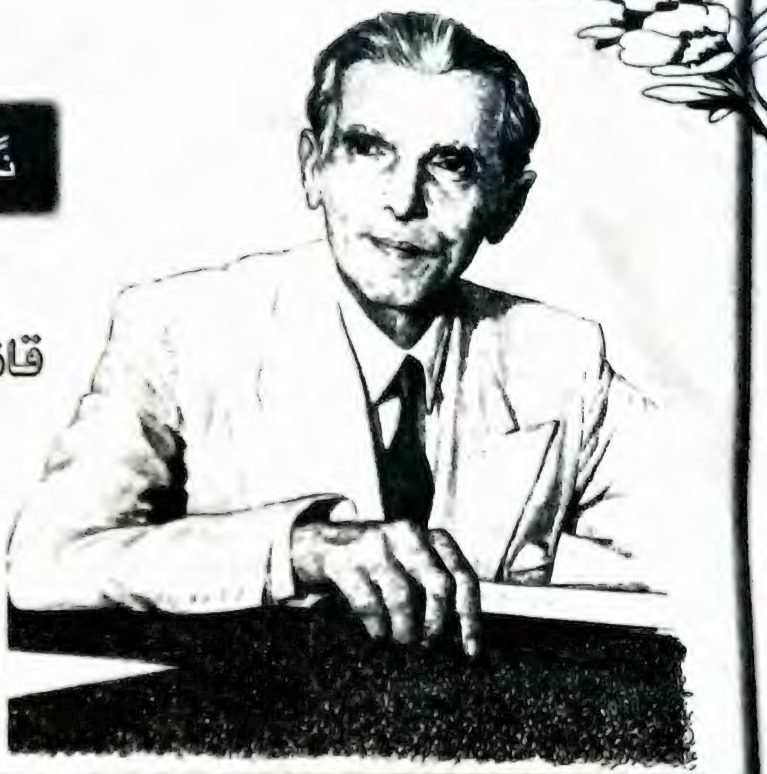

تاریخ پیدائش: 25 دسمبر 1876ء بروز پیر بمطابق 8 ذوالحجہ 1293ھ

مقام پیدائش: وزیر مینشن نیو نہم روڈ۔ کھارادر۔ کراچی

نام: خاندانی روایت کے مطابق ماموں قاسم موسیٰ نے محمد علی نام رکھا۔ والد جناح پونجا کے نام کی مناسبت سے آپ "جناح بھائی" کہلانے لگے۔ لیکن بیرسٹری کی سند لینے سے پہلے قائداعظمؒ نے بھائی کا لفظ حذف کرا دیا اور صرف محمد علی جناح نام رکھا۔ جناح کے لغوی معنی "قوتِ بازو" کے ہیں

حلیہ: قائداعظم محمد علی جناحؒ کا قد 5 فٹ ساڑھے گیارہ انچ تھا۔ رنگ گورا' آنکھیں گہری بھوری۔ دائیں گال پر تل۔ لمبی گردن جسم دبلا پتلا اور چاق چوبند۔

پسندیدہ کھیل: کرکٹ۔ بلیئرڈ۔ شطرنج

پسندیدہ پھول: گلاب۔ کارنیشن

لباس: آپ پہلے انگریزی لباس پہنتے تھے۔ 1937ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں پہلی مرتبہ چوڑی دار پاجامہ' شیروانی اور قراقلی ٹوپی پہنی (جسے بعد میں "جناح کیپ" کہا جانے لگا) قیام پاکستان کے بعد آپ نے انگریزی لباس ترک کر دیا اور وفات تک قومی لباس ہی پہنا یعنی شیروانی شلوار قمیض اور جناح کیپ۔

پسندیدہ مشغلہ: اخبارات کا مطالعہ۔ وہ دنیا بھر سے اخبارات منگواتے ان میں سے اپنی دلچسپی کی چیزیں تراشتے اور پھر ان کو فائلوں میں لگایا کرتے تھے۔ قائداعظمؒ یہ کام اتنے شوق اور انہماک سے کیا کرتے تھے کہ اکثر اس کام میں گھنٹوں صرف ہو جاتے۔

خوراک: قائداعظمؒ بہت کم خوراک تھے۔ کھانا بہت مختصر اور سادہ تناول فرماتے تھے البتہ پھلوں کا استعمال زیادہ کرتے تھے۔ زیارت (بلوچستان) میں اپنی علالت کے دوران انہوں نے ایک دن ڈاکٹروں سے حلوہ پوری کھانے کی خواہش ظاہر کی جو اُن کی اجازت سے محترمہ فاطمہ جناحؒ نے تیار کر کے ان کو پیش کیں۔

ذاتی ملازم: قائداعظمؒ صحت منداور قد آور ملازم رکھنا پسند کرتے تھے اور ان کو بہت صاف ستھرا اور چاق چوبند دیکھنا چاہتے تھے۔

☆☆☆☆☆

بانی پاکستانی قائداعظم محمد علی جناحؒ حد درجہ امانتدار' سچے اور خوددار انسان تھے۔ نہایت نفاست پسند تھے۔ نڈر' بے خوف اور مستقل مزاج تھے۔ ارادے کے پکے' وقت کے پابند' محنتی اور آئین پسند ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے خوش مزاج اور خوش لباس تھے۔

کارٹون کہانی

نرالے میاں کی شرارت

شاہد ریاض شاہد

نرالے میاں جونہی دوبارہ چھپنے لگے، گنجو میاں نے بھانپ لیا کہ یہ نرالے میاں ہی کی شرارت ہے۔

عین اُسی وقت سامنے ایک آدمی ٹرک میں کوڑا کرکٹ کے ڈرم لے جارہا تھا۔ گنجو میاں نے فوراً اُسے آواز دی:

وہ آدمی جلدی سے آیا، ڈرم کو مضبوطی سے بند کر کے ٹرک میں رکھا اور یہ جا، وہ جا!

گنجو بھائی! گنجو بھائی!! کھولو مجھے، ارے بچاؤ مجھے! نکالو یہاں سے!!

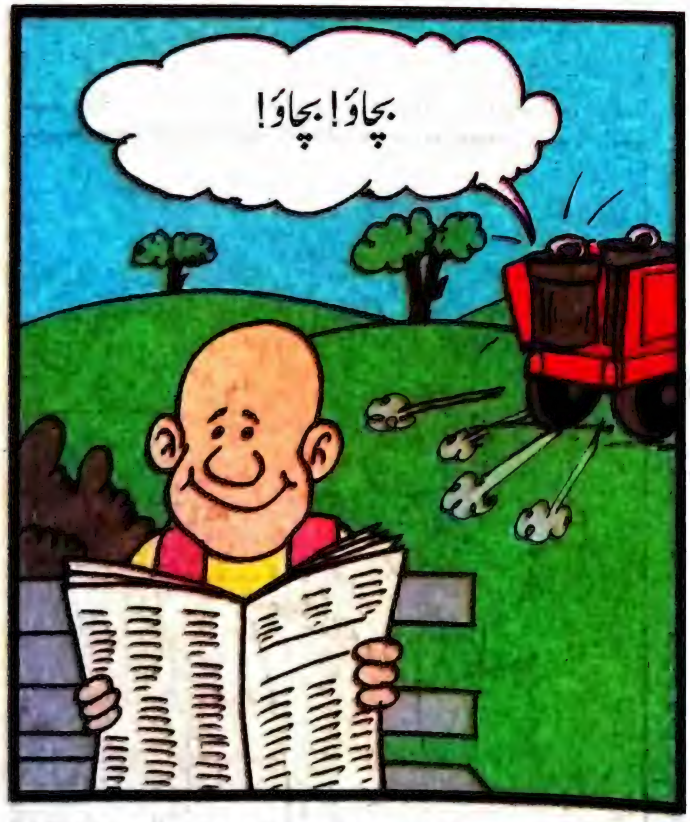

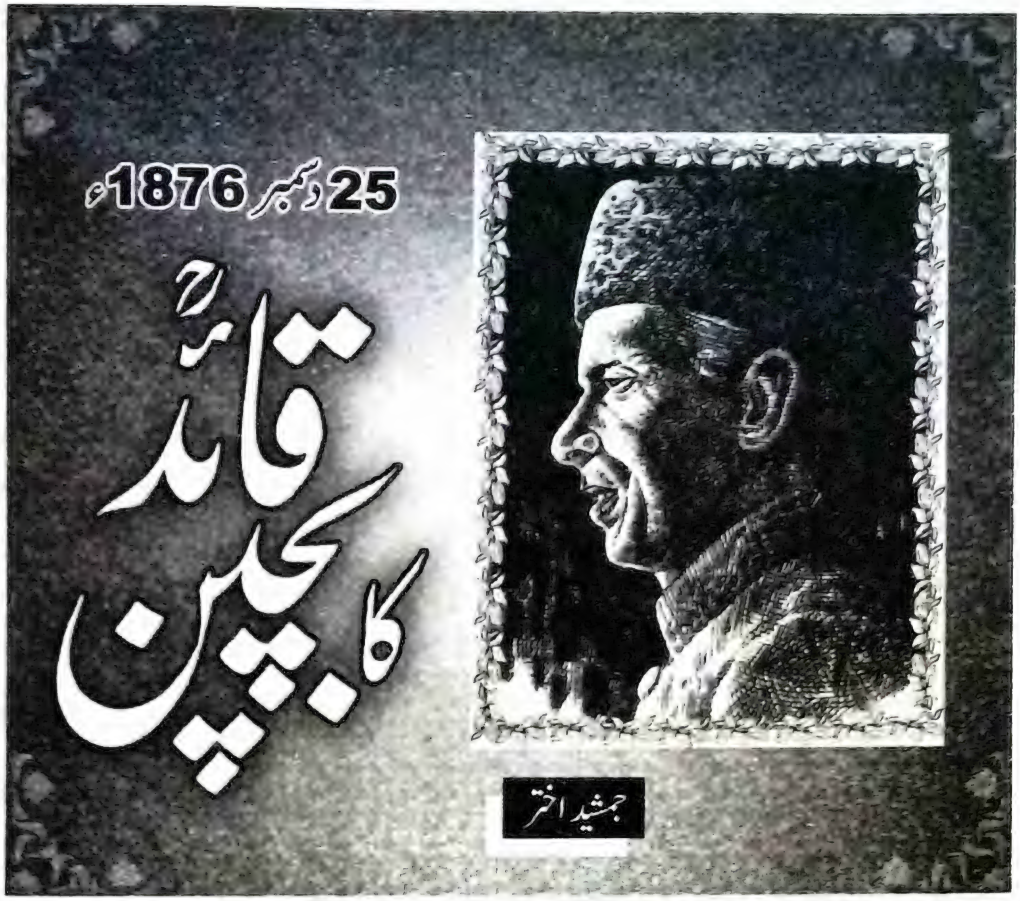

"..... برسوں پہلے کی بات ہے' کراچی کے ایک گھر میں اپنے والدین' کچھ عزیز و اقارب اور بہن بھائیوں کے ساتھ دبلا پتلا کمزور سا ایک لڑکا رہتا تھا۔ وہ تھا بڑا محنتی' ہر وقت لکھنے پڑھنے کی دُھن سر پر سوار رہتی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں لالٹین کی روشنی سوئے ہوئے دوسرے بہن بھائیوں کو پریشان نہ کرے' یہ بچہ پڑھتے وقت اُن کی طرف لالٹین کے آگے گتے کا ٹکڑا رکھ دیتا تھا اور خود دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔ اُس کی چچی نے اس کی محنت کا یہ حال دیکھا تو بے حد فکر مند ہوئیں۔ ایک روز کہنے لگیں: "بیٹا! تھوڑی بہت نیند بھی پوری کر لیا کرو۔ رات رات بھر جاگ کر پڑھتے رہتے ہو' کہیں بیمار نہ ہو جانا!"

"چچی جان! میں کیسے نہ محنت کروں' محنت نہیں کروں گا تو زندگی میں بڑا آدمی کیسے بنوں گا!" لڑکے نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ چھوٹی سی عمر اور اتنی بڑی بات! آخر وہ وقت بھی آیا جب اس ہونہار بچے کی محنت رنگ لائی اور ایک دن وہ واقعی بڑا نامور آدمی بنا۔ آیئے آج ہم آپ کو اُسی محنتی بچے کی کہانی سناتے ہیں۔

جس محنتی بچے کا ذکر ابھی ہم نے کیا ہے' اس کے ماں باپ ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقے کاٹھیاواڑ سے نقل مکانی کر کے کراچی آباد ہوئے تھے۔ آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے کاٹھیاواڑ کا علاقہ چھوٹی بڑی کئی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ ان میں ایک "گوندل" نامی ریاست بھی تھی۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ دیہاتوں میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ انہی میں ایک گاؤں "پانیلی" نام کا تھا۔ آبادی کم تھی بس گنے چنے گھر تھے۔ کچھ لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے اور کچھ تجارت۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تجارت کی غرض سے آنے والے انگریز اپنی ہوشیاری اور منصوبہ بندی کے بل بوتے پر ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے۔ اگرچہ انگریزوں کی آمد سے زندگی کے طور طریقے بدل رہے تھے مگر پانیلی گاؤں کے رہنے والے اب بھی بیل گاڑی کے زمانے میں رہتے تھے۔ سادہ لوگ اور سادہ زندگی! انہی لوگوں میں ایک پونجا بھائی بھی تھے' نہایت ہمت والے انسان۔ رات دیر تک اپنے ہاتھوں کھڈی پر کپڑا بنتے رہتے' کپڑا تیار ہو جاتا تو شہر جا کر فروخت کر آتے۔

انہی دنوں حالات کچھ یوں ہوئے کہ قحط سالی نے پوری آبادی کو ہلا کر رکھ دیا۔ لوگ گھر بار چھوڑ کر روزی رزق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اُن دنوں کراچی کا شہر ساحلِ سمندر پر ہونے کی وجہ سے تجارت اور ماہی گیری کے لیے مشہور تھا چنانچہ قسمت نے پونجا بھائی کے

گھرانے کو بھی اسی شہر میں لا آباد کیا۔ اُس وقت کراچی ماہی گیروں اور تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل بس چھوٹی سی ایک بستی تھی۔ اکثر آبادی ہندو تھی۔ مسلمان تھوڑے تھے۔ پونجا بھائی محنتی اور ہمت والے تو تھے ہی لہٰذا انہوں نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا۔ وہ یہاں چمڑے اور مچھلی کا کاروبار کرنے لگے۔ ان کا چھوٹا بیٹا جینا بھائی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ جینا بھائی تھا تو بڑا دبلا پتلا مگر بلا کا ذہین اور سمجھ دار تھا۔ "جینا" گجراتی زبان میں دبلے پتلے آدمی کو کہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ان کا یہ نام پڑا۔ گجراتی زبان ان لوگوں کی مادری زبان تھی۔ لفظ "جینا" آگے چل کر "جناح" میں تبدیل ہو گیا۔

جینا بھائی نے جو اب جینا پونجا کہلاتے تھے' بڑی لیاقت اور سمجھ داری کے ساتھ باپ کا کاروبار سنبھالا۔ باہر سے آنے والے تاجروں سے بھی ان کے خاصے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ انہی دنوں مٹھی بائی نامی نیک سیرت خاتون سے آپ کی شادی ہو گئی اور جلد ہی (25 دسمبر 1876ء بروز پیر بمطابق 8 ذوالحجہ 1293ھ) خدا نے چاند سا بیٹا بھی عطا کر دیا۔ ماموں نے اس بچے کا نام محمد علی رکھا۔ یہ وہی بچہ تھا جس کا واقعہ ہم نے آپ کو ابتدا میں سنایا ہے۔

محمد علی شروع ہی سے بڑا ذہین' سمجھ دار اور نفاست پسند تھا۔ کھیلنے کا بھی شوقین تھا۔ اس کے دوست بنٹے گولیاں' پتنگ' گلی ڈنڈا گویا ہر طرح کے کھیل کھیلتے تھے مگر اس طرح کے کھیلوں میں کپڑے اور ہاتھ پاؤں گرد و غبار سے اَٹ جاتے تھے اور یہ بات ننھے محمد علی کو بالکل پسند نہ تھی۔ اُسے پتنگ اُڑانا کافی اچھا لگتا تھا تاہم صفائی ستھرائی کے خیال سے گیند بلا یعنی کرکٹ کھیلنا اُسے زیادہ پسند آیا۔ کرکٹ اُسے اس لیے پسند تھی کہ اس کھیل میں کپڑے صاف ستھرے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن اُس نے گیند بلا خریدا اور اپنے ہمجولیوں کو بھی اسی کھیل کی طرف مائل کر لیا۔

بچپن کے دن یونہی کھیل کود میں گزر رہے تھے کہ ابا کو اس کی پڑھائی کی فکر ہوئی۔ چنانچہ ہونہار محمد علی کو قریب کے ایک سکول "سندھ مدرستہ الاسلام" میں داخل کرا دیا گیا۔ اس مدرسے میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھانے کا بھی خاص بندوبست تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پونجا جناح نے محمد علی کی ابتدائی تعلیم کے لیے اس درسگاہ کو نہایت مناسب سمجھا اور اپنے بیٹے کو اسی میں داخل کرایا۔

پونجا جناح کا ایک کاروباری انگریز دوست ہونہار محمد علی کی لیاقت اور ذہانت سے بڑا متاثر تھا۔ اُس نے مشورہ دیا کہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجو۔

پونجا جناح کی دلی آرزو بھی تھی کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک کامیاب اور بڑا آدمی بنے لہٰذا انہوں نے محمد علی کو انگلستان بھیجنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ جنوری 1893ء کے دن تھے کہ محمد علی گھر والوں کو الوداع کہہ کر لندن جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہو گیا۔ سولہ سترہ برس کی عمر آخر کیا ہوتی ہے' ذرا اندازہ تو کریں..... اپنے والدین بہن بھائیوں اور دوستوں سے جدا ہوتے ہوئے کم سن محمد علی کے دل و دماغ پر کیا بیت رہی ہو گی۔

انگلستان پہنچ کر اس بچے نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور شہرہ آفاق درسگاہ "لنکنز ان" سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر وطن واپس لوٹا۔ اب نوجوان محمد علی جناح کی شخصیت اور مزاج میں ایک ٹھہراؤ' سنجیدگی اور حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں نظر آتا تھا۔ کل کا لمبا پتلا' دراز قد اور گہری سوچتی آنکھوں والا دھان پان سا محمد علی اب ایک پروقار اور خوش پوش قانون دان کے روپ میں جلوہ گر ہو رہا تھا۔ اس وقت کون جان سکتا تھا کہ رات رات بھر جاگ کر پڑھنے والا یہ بچہ ایک دن غلام ہندوستان کی تقدیر بدل دے گا اور یہاں کے کروڑوں مسلمانوں کا ہر دلعزیز رہنما ثابت ہو گا۔ پیارے بچو! یہی محمد علی جناح آگے چل کر "قائداعظم" بنے اور خدا کے فضل و کرم سے انہی کی رہنمائی میں مسلمانوں نے "پاکستان" کی صورت میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی اور نظریاتی مملکت حاصل کی۔ (ماخوذ)

پاکستان ٹیلی ویژن پر جب بھی خبرنامہ دیکھنے' سننے کا موقع ملے تو اس سے پہلے سکرین پر پیارے نبی ﷺ کے فرمانِ مبارک کے ساتھ بڑے خوبصورت انداز میں اوپر دائیں کونے میں سنہری دائرے کی سی شکل میں "محمدؐ رسول اللہ" کچھ اس طرح لکھا ہوا دکھایا جاتا ہے کہ اوپر "اللہ" درمیان میں "رسول" اور نیچے پیارے نبیؐ کا نامِ مبارک "محمدؐ" لکھا ہوتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ اکثر بچے سوچتے ہوں گے کہ یہ کس چیز کا عکس ہے؟ آج ہم آپ کو اسی کے بارے میں بتانا چاہیں گے۔

ننھے ساتھیو! یہ دائرہ دراصل "مہر نبویؐ" کا عکس ہے۔ "صلح حدیبہ" کے متعلق تو آپ بخوبی جانتے ہوں گے۔ کفارِ مکہ اور آنحضور ﷺ کی سرکردگی میں تمام مسلمانوں کے درمیان طے پانے والا یہ معاہدہ ہی دراصل فتح مکہ کی بنیاد بنا تھا۔

اِس صلح کے بعد پیارے نبی ﷺ نے آس پاس کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دینا چاہی اور اس سلسلے میں انہیں خطوط لکھے تو آپؐ کے ایک جاں نثار صحابی حضرت سلمان فارسیؓ نے مشورہ دیا کہ اِن خطوط پر آنحضور ﷺ کے نام کی مہر بھی ثبت ہونی چاہیے' اس لیے کہ یہ بادشاہ اور حکمران صرف اُسی خط یا پیغام کو معتبر سمجھتے ہیں جس پر لکھنے والے کی طرف سے باقاعدہ مہر لگی ہوئی ہو۔ چنانچہ رسولِ خدا ﷺ نے اس مقصد کے لیے ایک چاندی کی انگوٹھی بنوائی۔ اِس انگوٹھی کا نگینہ بھی چاندی کا تھا۔ اس پر تین سطروں میں "محمدؐ رسول اللہ" اس طرح لکھا ہوا تھا کہ "اللہ" کا لفظ سب سے اوپر' درمیان میں "رسول" اور نیچے "محمدؐ" یعنی آنحضورؐ کا نامِ مبارک تھا۔ اس انگوٹھی کو آپؐ دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں پہنتے تھے۔ اس کا نگینہ آپؐ اپنی ہتھیلی کی طرف رکھتے تھے۔ آنحضور ﷺ تمام خطوط' پیغامات اور حکم ناموں کے لیے یہ مہر استعمال فرمایا کرتے تھے۔

آج بھی عہد رسالت میں لکھے گئے مختلف حکمرانوں اور بادشاہوں کے نام جو بھی خطوط محفوظ ہیں ان پر تحریر کے آخر میں یہی مہر ثبت ہے۔ بعد میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں بھی یہی مہر استعمال کی جاتی رہی۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ سوم اس مہر کو چھ سال تک استعمال کرتے رہے۔ ایک روز آپؓ اریس کے کنویں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ انگوٹھی اچانک ان کی انگلی سے نکل کر کنویں میں جا گری۔ بہت تلاش کے باوجود یہ مبارک انگوٹھی نہ مل سکی۔ کہا جاتا ہے کہ اِس واقعہ کے بعد ہی سے مسلمان سلطنت میں فتنہ و فساد اور دشمنوں کی سازشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

آپ بھی لکھیے

میرا اللہ، میرا مالک

فضہ ضیاء، کھاریاں کینٹ

میں نے آنکھیں اس دنیا میں کھولی ہیں جس میں ہر طرف مجھے صرف اور صرف اللہ ہی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہ سورج جتنا خوبصورت اور روشن ہے، میں سوچتی ہوں کہ اس کو بنانے والا یعنی اللہ پاک، خود کتنا خوبصورت ہوگا۔ یہ چاند ہمیں جتنی خوبصورت روشنی اور ٹھنڈی چاندنی دیتا ہے میرے اللہ کا نور تو اس سے بھی زیادہ دلکش ہوگا۔ میں سوچتی ہوں میرا اللہ کتنا مہربان ہے۔ وہ اپنے ان بندوں پر بھی رحم فرماتا ہے جو اس کو پہچانتے ہی نہیں۔ اس کی رحمت چرند پرند، انسان حیوان، سب پر عام ہے۔

اس وقت میں انہی باتوں کو سوچ رہی ہوں۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے مجھے قلم اور علم کے ذریعے مجھے پہچان عطا کی اور جہالت کے اندھیروں سے دور رکھا۔ کسی پریشانی کا سامنا ہو تو میرا اللہ ہی ہے جو پریشانیوں کو دور کر کے سکون اور اطمینان کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ یہ میرا اللہ ہی تو ہے جس نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے مسلمان گھرانے میں پیدا فرمایا اور زندگی جیسی نعمت سے سرفراز کیا۔ ذرا سوچئے تو! بچے کو چوٹ لگے اور وہ تکلیف سے بلبلانے لگے تو اس کی ماں کتنی بے قرار ہو کر دوڑی چلی آتی ہے، اپنے بچے کو اٹھاتی اور سینے سے لگاتی ہے۔ اللہ کی محبت تو اس سے ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ ہے۔

کسی کو تکلیف پہنچے تو بے ساختہ منہ سے "ماں" کا لفظ نکلتا ہے مگر یقین کیجئے کسی بھی طرح کی تکلیف یا پریشانی ہو، میرے منہ سے یہی الفاظ نکلتے ہیں: یا اللہ میری مدد فرما۔ اس لیے کہ وہی تو ہے جس نے ہمیشہ میری دعائیں سنی ہیں اور اپنی مہربانیوں سے میرا دامن بھرا ہے۔ یہ اسی کا احسان ہے کہ اس نے مجھے خوبصورت ترین ملک "پاکستان" میں پیدا کیا۔ جس کا قیام ہی دین اسلام کی بنیاد پر عمل میں آیا ہے۔

میرے اللہ کو مجھ سے بہت محبت ہے۔ وہ اپنے بندوں سے بے حد محبت کرتا ہے۔ میرا اللہ اتنا رحم کرنے والا اور سننے والا ہے کہ انسان چاہے کسی بھی زبان میں دعا مانگے وہ سنتا ہے اور قبول فرماتا ہے۔ میرا اللہ صرف "بسم اللہ" کہنے سے میری تمام مشکلیں آسان کر دیتا ہے۔

یہ میرے اللہ ہی کی رحمت اور مہربانی ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو دین اسلام عطا کیا جس میں سلامتی ہی سلامتی ہے۔ میرا اللہ وہ ہے جس نے ہمیں سب سے پیارے اور بلند مرتبہ رسول حضرت محمد ﷺ کی امت میں پیدا کیا۔ جن کے ذریعے قرآن پاک کی صورت میں ہمیں مکمل کتاب ہدایت ملی۔

اچھے ساتھیو! میں اپنی ظاہری آنکھ سے اپنے پیارے اللہ کو دیکھ تو نہیں سکتی تاہم دل کی آنکھ سے اسے ضرور دیکھتی ہوں۔ وہ ہمارا مالک و مختار، ہمارا معبود، ہماری مدد کرنے والا، اندھیروں سے نکالنے والا اور ہمیں ہدایت کی روشنی بخشنے والا ہے۔ اللہ کی ہم پر اتنی بے شمار نعمتیں، مہربانیاں اور رحمتیں ہیں اور ہم کیسے ہیں کہ اللہ کو یاد ہی نہیں رکھتے!

(پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

سچی خوشی

حنا لیاقت، لاہور

"ثانیہ بیٹا اٹھ کر نماز پڑھ لو"۔ اماں جی کی آواز ثانیہ کے کانوں میں گونجی۔ عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں اور ثانیہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ آج وہ بہت تھک گئی تھی اس لئے اسے نیند بھی آ رہی تھی اور نماز کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ لیکن سردی کی وجہ سے اس کا گرم بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اٹھ کر نماز ادا کر لے، اسے ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ: رہنے دو ثانیہ تم بہت تھکی ہوئی ہو۔ سو جاؤ اب کہاں گرم بستر کو چھوڑ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرو گی اور نماز پڑھو گی

'رہنے دو نماز کو' سو جاؤ ثانیہ!

یہ شیطان تھا جو ثانیہ کو بہکا رہا تھا۔ ثانیہ اس کے بہکاوے میں آ کر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی اور شیطان اپنی کامیابی پر مسکرانے لگا۔ ابھی ثانیہ لیٹی ہی تھی کہ اسے عجیب عجیب خیالات آنے لگے۔ اس نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی نعمتیں دی ہیں ہر چیز ہمارے پاس ہے کھانے کے لئے، پہننے کے لئے اور اتنا کچھ کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور اس کے بدلے میں ہمیں پانچ نمازوں کا تحفہ دیا اور ہم اتنے گنہگار ہیں کہ پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اس نے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں نعمتیں دی ہیں اور ہم بدلے میں اس کا کہنا بھی نہ مانیں۔ کتنی بری بات ہے! وہ ہمیں ہر روز پانچ وقت اپنے گھر میں دعوت دیتا ہے لیکن ہم دھیان ہی نہیں دیتے۔ یہ سوچتے ہی ثانیہ ایک عزم کے ساتھ اٹھی اور وضو کرنے چلی۔ آج نماز پڑھ کے اسے سچی خوشی ملی تھی۔ کیونکہ اس نے شیطان کو شکست دے دی تھی۔ (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

نیک عہد

سعدیہ گل، چیچہ وطنی

آج شعبان کی 30 تاریخ تھی۔ جوں ہی چاند نظر آیا ثناء خوشی خوشی بھاگی آئی اور اپنے امی ابو سے کہنے لگی: آپ کو رمضان کی بہت بہت مبارک ہو۔ پھر بھائی کو مبارک دی۔ اس کے ماں باپ اور بھائی نے بھی اسے مبارک دی۔

خوشی کے باعث رات بہت مشکل سے گزری۔ صبح سحری کرنے کے بعد وہ سکول کی تیاری کرنے لگی۔ سکول جا کر سب سے پہلے کنول سے ملی اور اسے مبارک دی۔ پھر کہنے لگی: کنول آج شام میں تمہیں لینے آؤں گی ہم روزہ افطار کرنے کے لیے کچھ چیزیں بازار سے لے کر آئیں گی۔ "کیوں نہیں ضرور جائیں گے" کنول نے جواب دیا۔ "ہمارے لیے ماہ رمضان کتنی برکتوں کا مہینہ ہے۔ یہ ہمارے لیے عید کی خوشیاں بھی تو لے کر آتا ہے"۔

دونوں بازار سے چیزیں خرید رہی تھیں کہ اچانک ایک فقر نے صدا لگائی۔ ثناء کو غصہ آنے لگا اور کنول سے بولی: "یہ آوازیں مجھے بہت بری لگتی ہیں۔ دل تو کرتا ہے کہ اسے کھری کھری سناؤں۔ انہوں نے تو کاروبار بنایا ہوا ہے جس کو کوئی کام نہیں ملتا وہ فقیر بن جاتا ہے۔"

کنول نے دھیرے سے جواب دیا: "ثناء ایک تو تم نے اسے کچھ دیا نہیں اور پھر اسے برا بھلا کہا کتنی بری بات ہے! ہمارے نبی ﷺ نے کبھی کسی فقیر کو برا بھلا نہ کہا اور کبھی کوئی فقیر آپ کے در سے خالی نہ جاتا تھا۔ آپ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ نے تین دن پانی سے روزہ افطار کیا۔ کس وجہ سے؟ اس لیے کہ جب بھی آپؓ افطار کے لئے کھانا لگاتیں فقیر آجاتا اور آپؓ وہی کھانا اٹھا کر فقیر کو دے دیتیں اور خود پانی سے افطار کرتیں۔ لیکن آپؓ کوئی شکوہ زبان پر نہ لائیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ: سائل کو مت جھڑکو!"

ثناء نے کنول کی باتیں بہت غور سے سنیں اور بولی: میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں خدا سے معافی مانگتی ہوں اور تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے مجھے سیدھی راہ دکھائی ہے۔ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔ (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

ہمارا قائد

آمنہ رحمان، ملتان

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتے تھے۔ ایک دن حالات کا مارا ہوا ایک طالب علم اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور کسی جگہ کی نشاندہی کرتا ہوا بولا کہ اگر آپ میری سفارش کر دیں تو مجھے ملازمت مل جائے گی۔ قائداعظم نے فوراً انکار کر دیا کہ میں کسی کی سفارش نہیں کرتا۔ یہ میری زندگی کا اصول ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر قائداعظمؒ نے اس نوجوان سے چند سوال پوچھے؟ کیا دوران طالب علمی کبھی کھیلوں میں حصہ لیا تھا؟

طالب علم نے جواب دیا: نہیں۔

پھر قائداعظمؒ نے اُس سے یہ پوچھا کہ کالج یا یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیوں میں تم حصہ لیتے تھے؟ طالب علم نے پھر نفی میں جواب دیا۔

تیسرا سوال قائداعظمؒ نے یہ پوچھا کہ کالج یا یونیورسٹی میں کوئی بھی ایسی مشغولیت جس میں تم نے حصہ لیا ہو؟

اِس مرتبہ بھی نوجوان نے نفی میں سر ہلایا۔ قائداعظمؒ نے نوجوان کو ڈانٹ دیا: نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ میں تم جیسے نکمے اور فضول آدمی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ نوجوان افسردگی سے پیچھے ہٹا اور الوداعی سلام کر کے یہ کہتا ہوا رخصت ہوا کہ آپ میری سفارش کریں

یانہ کریں لیکن میں ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ سن کر قائداعظمؒ اس نوجوان کی طرف لپکے لیکن وہ کمرے سے جاچکا تھا۔ قائداعظمؒ نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ اس نوجوان کو بلا کر دوبارہ میرے پاس لاؤ۔ سیکرٹری نے نوجوان کو دوبارہ قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر کیا۔

اُس کو دیکھتے ہی قائداعظمؒ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ نوجوان سے مخاطب ہوئے کہ میں تمہاری سفارش کردوں گا۔ لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی جھوٹ نہیں بولو گے' بالکل اس طرح جس طرح تم نے ابھی کیا۔ قائداعظمؒ نے پہلی بار سچ کی خاطر اپنے قیمتی اصول کو قربان کر دیا۔ اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم ہمیشہ سچ بولیں کیونکہ سچ بولنے میں ہی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

(چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

ریاکاری

محمد عمران الحق' میرپور آزاد کشمیر

انسان یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ وہ نیک انسان ہے تو دوسرے لوگ اس کی عزت بھی کریں گے اور اس پر اعتماد بھی۔ اس مقصد کے لیے وہ دکھاوے کی نمازیں پڑھتا ہے' حج کو جاتا ہے تو جانے سے پہلے اور بعد میں دعوتوں اور تحائف کے تبادلے کا ایک لمبا سلسلہ شروع کر لیتا ہے۔ اپنی درویشی اور بزرگی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے حالانکہ اللہ کے نزدیک صرف ایسی نیکی قبول ہوتی ہے جو خلوص دل سے کی جائے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: رنج و غم کے کنویں سے اللہ کی پناہ مانگو۔ پوچھا گیا غم کا کنواں کیا ہے؟ فرمایا "جہنم میں ایک وادی ہے جس سے خود جہنم بھی دن میں چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے" عرض کیا گیا: اللہ کے رسولؐ! اس میں کون لوگ جائیں گے۔ فرمایا: "وہ بڑے عبادت گزار اور زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنے والے جو اچھے اعمال دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔" اس طرح رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ بعد کے زمانے میں کچھ ایسے ریاکار لوگ پیدا ہوں گے جو دین کی آڑ میں دنیا کا شکار کریں گے۔ لوگوں پر اپنی دین داری کا رعب قائم کرنے کے لیے موٹا جھوٹا لباس پہنیں گے۔ ان کی زبانیں شکر سے میٹھی ہوں گی اور دل بھیڑیے جیسے ظالم۔ یہ تمام کام بہت نیکی اور اجر و ثواب کے ہیں لیکن منافقت کی وجہ سے ان کے کرنے والوں کو ثواب کی بجائے عذاب ملے گا۔

(پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

بزرگوں کا احترام

نبیہہ عظمت' لاہور

"سارہ بیٹا..... ایک گلاس پانی تو پلانا" ایک کمزور سی آواز نے سب کو متوجہ کیا۔ سارہ اور اس کی سہیلیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"سارہ' اندر کمرے میں کون ہے؟" اس کی دوست حرا نے پوچھا۔

"اوہ! وہ میرے دادا ہیں۔" سارہ نے چڑ کر کہا۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ کھیلنے لگی۔

"سارہ' تمہارے دادا نے تمہیں بلایا ہے' کیا تم ان کی بات نہیں سنو گی؟" نبیہہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہونہہ! ..... یہ تو ہر وقت مجھے ہی بلاتے رہتے ہیں"۔ سارہ نے منہ پھلا کر کہا۔

"لیکن سارہ! بچپن میں تو تم اپنے دادا سے بہت پیار کرتی تھی اور ہمیں ان کی کہانیاں سنایا کرتی تھی" حرا بولی۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن اب وہ بوڑھے ہو گئے ہیں اور ہر وقت مجھ سے کام کرواتے ہیں" سارہ نے جواب دیا۔

"سارہ' اگر تم ان کی خدمت کرو گی تو ایک دن جنت کی حق دار ہو گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اس بندے پر افسوس ہے جس کے گھر میں بزرگ ہوں اور وہ جنت میں نہ گیا ہو۔ تم یہ مت بھولو کہ ہم سب نے بوڑھا ہونا ہے۔ اگر تم اپنے دادا کے ساتھ ایسا سلوک کرو گی تو تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہو گا"۔ یہ کہہ کر نبیہہ وہاں سے اٹھی اور ایک گلاس پانی کا لے کر دادا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ حرا بھی اس کے پیچھے چلی۔ سارہ جب وہاں گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ دونوں دادا کے پاؤں دبا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر سارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دن اور آج کا دن سارہ اپنے دادا کی بھرپور خدمت کرتی ہے اور جنت کماتی ہے۔ آپ بھی اپنے بزرگوں کی خدمت کریں اور جنت کمائیں۔ (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

آیئے دوست بنائیں

میر افغان شینواری 15 سال
کمپیوٹر سیکھنا، کہانیاں پڑھنا
محلہ حاجی پیر دل خان جنگل خیل ضلع و تحصیل کوہاٹ

عمر انجم 13 سال
بیڈ منٹن کھیلنا
مکان نمبر 3 فیصل ٹاؤن چکلالہ راول پنڈی

محمد مزمل 13 سال
مطالعہ کتب
B-1809 باغیچیات علی شاہ سکھر

محمد جنید انجم 18 سال
قلمی دوستی، مطالعہ کرنا
پنڈی سید پور
تحصیل پنڈ دادنخان ضلع جہلم

محمد کامران 17 سال
قلمی دوستی، شعر و شاعری
خواجہ اشفاق محلہ کوٹ کلاں پنڈ دادنخان ضلع جہلم

محسن رضا 15 سال
کمپیوٹر، کرکٹ
701۔ دہلی روڈ صدر بازار لاہور۔

عثمان عارف 14 سال
کرکٹ کھیلنا، نماز پڑھنا
B - 170 ماڈل ٹاؤن بی بہاولپور

مطیع الرسول 15 سال
کمپیوٹر
تکیہ مندرانوالا غازی آباد نزد مسجد نور الٰہی لاہور

محمد مہران ظفر لانگ 10 سال
کہانیاں پڑھنا، کرکٹ کھیلنا
موہن لانگ شمالی ڈاکخانہ خاص تحصیل و ضلع جھنگ

تحسین احمد 17 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
بامقام خولیاں شاہ حسین ڈاکخانہ ڈنگہ تحصیل کھاریاں ضلع گجرات

حمزہ قیصر 11 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا۔ شرارتیں
لوئر جھیکا۔ گلی روڈ فلیٹ نمبر 4 کمیٹی کالونی۔ مری

معظم علی 15 سال
کمپیوٹر چلانا
محلہ اسلام پورہ ٹوبہ ٹیک سنگھ گلی 5 نمبر

عمر خان 15 سال
محبت کرنا، پیار کرنا
خان الیکٹرک سٹور آر۔ اے بازار لاہور

جبران طارق 8 سال
کرکٹ کھیلنا
404 فرسٹ ایونیو
منگلا کینٹ

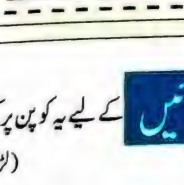

عدنان احمد سبحانی 12 سال
کرکٹ کھیلنا۔ مطالعہ کرنا
محلہ بنی پورہ ڈنگہ ضلع گجرات

عاطف عتیق صدیقی 15 سال
قرات کرنا، کرکٹ کھیلنا
محلہ عید گاہ درویش روڈ ہری پور ہزارہ۔

انیس احمد 17 سال
مطالعہ اور والدین کی خدمت کرنا
مکان نمبر 308، B-4 مسلم ٹاؤن راولپنڈی

محمد نہال علیم 11 سال
فٹ بال کھیلنا
نظمہ آباد 2 13/5 - II-k
74600-18 کراچی

مرزا محمد عثمان 8 سال
کرکٹ کھیلنا اور پڑھنا
طارق بن زیاد کالونی 20/Z ساہی وال۔

محمد علی 17 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
مکان نمبر 262 چھوٹی ٹڈل نزد ڈاکٹر وسیم کلینک تحصیل و ضلع اٹک

محمد عمران طاہر 16 سال
دینی کتب کا مطالعہ
جامعہ عزیزیہ قاسمہ العلوم۔ سرگودھا۔

امان اللہ خان 20 سال
سائنسی کتابوں کا مطالعہ کرنا
میٹرو ول نمبر 2 مکان نمبر D-62 سائٹ کراچی

آیئے دوست بنائیں کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام .... عمر ....
....
مشاغل ....
....
پتا ....
....

ہونہار مصور

عید مبارک

1

محمد شہاب' راولپنڈی (پہلا انعام:100روپے کی کتابیں)

2

سہیل اصغر راجا' موہری شریف (دوسرا انعام:75روپے کی کتابیں)

3

علی طاہر انصاری' سیالکوٹ (تیسرا انعام:50روپے کی کتابیں)

4

نازش سیمی' واہ کینٹ (چوتھا انعام:45روپے کی کتابیں)

5

عبدالحسیب' چکوال (پانچواں انعام:40روپے کی کتابیں)

6

مائدہ عابد' گوجرانوالا (چھٹا انعام:35روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:۔ آسیہ رحمان لاہور کینٹ۔ حسیب حسن چغتائی ڈیرہ غازی خان۔ ندیم اصغر راجا ایتھنز۔ فارحہ زعفران ڈیرہ غازی خان۔ غلام محی الدین فیصل آباد۔ کبیر خان ایبٹ آباد۔ کنیز عائشہ کراچی۔ سبین مصطفیٰ اٹک۔ حفصہ خان پسرور۔ نور جاوید حیدر آباد۔ لالہ رخ سرگودھا۔ آسیہ رفیق گکھڑ منڈی۔ عبداللہ خان لاہور۔ عرفان یوسف منڈی بہاءالدین۔ عائشہ قمر نواب شاہ۔ آئلہ ساجد ڈار لاہور۔ خرم نواز تلہ گنگ۔ سارہ نقوی ٹیکسلا۔ محمد ساجد چشتیاں۔ گوہر شاہ یزمان۔ احمد سلیم بہاولپور۔ اصغر خان کوئٹہ۔ مدیحہ نواب لاہور۔ گلریز خان کوہاٹ۔ فرح جاوید لاہور۔ فریدہ یوسف آزاد کشمیر۔

جنوری کا موضوع:
سردی آئی

آخری تاریخ 10 دسمبر

فروری کا موضوع:
ہمارا باغ

آخری تاریخ 10 جنوری

ہدایات: تصویر 6انچ چوڑی، 9انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

فائل کی گمشدگی

منظر رضا ہاشمی

طاہر اور طیب اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر گہرے مطالعے میں غرق تھے کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ طاہر نے رسیور اُٹھایا۔

"السلام علیکم! راحت بول رہا ہوں"۔ دوسری طرف سے انسپکٹر راحت کی آواز آئی۔

"وعلیکم السلام..... بھائی جان! سنایئے' خیریت ہے؟" طاہر نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس پر نو بج رہے تھے۔

"طاہر! تم طیب کو لے کر فوراً محکمہ سیاحت کی پرانی عمارت میں پہنچو۔ میں وہیں پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں"۔ انسپکٹر راحت نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں..... کیا ہوا؟" طاہر نے چونک کر پوچھا۔

"باقی سب باتیں وہیں پر ہوں گی۔ تم فوراً پہنچو" انسپکٹر راحت نے تیزی سے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

"راحت بھائی نے بلایا ہے؟" طیب نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

"ہاں..... وہ کہہ رہے ہیں جلدی پہنچیں..... میرے خیال میں کوئی نیا مسئلہ در پیش ہے"۔ طاہر نے کتاب ایک طرف رکھ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ ساتھ طیب بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور کچھ ہی دیر میں یہ لوگ محکمہ سیاحت کی پرانی عمارت کے سامنے موجود تھے جہاں انسپکٹر راحت اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ انسپکٹر راحت نے انہیں بتایا کہ یہ عمارت پہلے محکمہ سیاحت کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتی تھی بعد میں یہ دفتر کسی اور جگہ شفٹ کر دیا گیا اور اس عمارت کو محکمہ دفاع نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ مگر اسے کسی فیلڈ ورک کی بجائے حساس ریکارڈ کے سٹور روم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ابھی چند گھنٹے قبل مجھے محکمہ دفاع کی طرف سے فون ملا ہے کہ یہاں سے ایک اہم فائل چوری ہوگئی ہے۔ اس لیے میں نے تم دونوں کو کال کیا ہے تاکہ مل کر فائل تلاش کر سکیں۔

"یہاں پر سیکورٹی کا تو اچھا خاصا انتظام ہو گا پھر یہ

فائل کیسے چوری ہو گئی؟"۔ طاہر نے حیرت سے کہا۔

"اصل میں حکام کو اس طرف زیادہ خطرہ نہیں تھا کیونکہ باہر محکمہ سیاحت کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ بڑے گیٹ پر ہر وقت دو گارڈ موجود رہتے ہیں اور اندر تہہ خانے میں جہاں ریکارڈ ہے وہاں بھی ہر وقت دو محافظ ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ مجرموں نے بڑی حیرت انگیز چال چلی۔ وہ یوں کہ ساتھ والی کوٹھی میں ایک بڑا درخت موجود ہے جس کی لمبی لمبی شاخیں اس عمارت تک آرہی ہیں اور ساتھ والی کوٹھی اکثر خالی رہتی ہے کیونکہ اس کے مالکان باہر رہتے ہیں۔ مجرم پہلے ساتھ والی کوٹھی میں گئے۔ وہاں سے درخت پر چڑھ کر وہ اس کوٹھی تک پہنچے۔ اس لیے گارڈز کو پتا نہ چل سکا کیونکہ وہ بیرونی دروازے پر تھے۔ مجرموں نے تہہ خانے میں گھس کر ایک گارڈ کو بے ہوش کیا۔ دوسرا گارڈ چونکہ واش روم میں تھا اس لیے وہ محفوظ رہا۔ پھر مجرموں نے لیزر پسٹل کی مدد سے شیلف کا آہنی لاک توڑا۔ وہ فائل لے کر پلٹ ہی رہے تھے کہ دوسرا گارڈ واش روم سے باہر آگیا۔ اُن کی آپس میں مڈبھیڑ ہو گئی چنانچہ مجرموں نے فائر کر کے اسے زخمی کر دیا اور فائل لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ واپسی میں بھی وہ اُسی درخت کے ذریعے ساتھ والی کوٹھی میں گئے اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ باہر والے گارڈ اس سارے واقعے سے بے خبر رہے کیونکہ یہ سارا واقعہ اندر تہہ خانے میں رونما ہوا"۔ انسپکٹر راحت نے تمام واقعات تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... آپ میرے ساتھ چلیں اور وہ تہہ خانہ دکھائیں جہاں یہ واردات ہوئی ہے"۔ طاہر نے کہا۔ انسپکٹر راحت ان دونوں کو لے کر اس تہہ خانے میں آگئے۔ طاہر اور طیب نے ہر چیز کا غور سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔

"جو گارڈ مجرموں سے مزاحمت کے دوران زخمی ہوا تھا وہ کہاں ہے"۔ طاہر نے پوچھا۔ "اسے ہسپتال بھجوا دیا گیا ہے"۔ انسپکٹر راحت نے جواب دیا۔

"اس نے مجرموں کا کوئی حلیہ وغیرہ بھی بتایا ہے؟" طاہر نے دوبارہ پوچھا۔ "ہاں اس نے بتایا ہے کہ مجرموں کی تعداد دو تھی اور جو حلیہ اس نے بتایا ہے اس کے مطابق ہم نے ایک ماہر سے ان کے خاکے تیار کرائے ہیں"۔ انسپکٹر راحت نے جواب دیا اور پھر جیب سے دو تصویریں نکال کر طاہر اور طیب کو دکھائیں۔

"کیا پولیس ریکارڈ میں اس حلیے کے افراد پہلے بھی کسی واردات میں ملوث رہے ہیں؟"۔ طاہر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "یہ سکیچز تمام تھانوں کو روانہ کیے گئے تھے اور ابھی چند لمحے پہلے یہ رپورٹ ملی ہے کہ یہ دونوں چہرے بالکل اجنبی ہیں"۔ انسپکٹر راحت نے جواب دیا "آپ کے خیال میں کون لوگ اس واردات میں ملوث ہو سکتے ہیں؟"۔ طاہر نے پھر سوال کیا۔

"اس فائل کا تعلق چوں کہ دفاعی امور سے ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ ہمارا ہمسایہ ملک ہی اس میں ملوث ہو سکتا ہے"۔ انسپکٹر راحت نے جواب دیا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فائل چرانے والے خود بھارتی ایجنٹ تھے یا انہوں نے کسی دوسرے پیشہ ور گروہ کی خدمات حاصل کیں"۔ طاہر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں نے گارڈ سے ہر بات تفصیل سے پوچھی ہے۔ اُس نے جو حلیے بتائے ہیں اُن کی بنیاد پر تو کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے"۔ انسپکٹر راحت نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ سن لیں کہ آپ کے یہ دونوں تیار شدہ سکیچز بیکار ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ لوگ حلیے تبدیل کر کے آئے ہوں گے اور دوسری بات یہ بھی سن لیں کہ اس واردات میں براہ راست بھارتی ایجنٹ ملوث ہیں کیونکہ پاک بھارت کے موجودہ کشیدہ حالات کی وجہ سے وہ کسی پاکستانی جرائم پیشہ گروہ سے کام لینے کا رِسک نہیں لے سکتے"۔ طاہر نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"ویسے تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایئرپورٹ اور بندرگاہ پر چیکنگ سخت کر دینی چاہیے۔ کیونکہ اگر یہ بھارتی ایجنٹ ہیں تو فوراً فرار ہونے کی کوشش

کریں گے"۔ انسپکٹر راحت نے چونکتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے پینٹ کی جیب سے موبائل سیٹ نکال لیا۔ ہیلو سب انسپکٹر عارف! میں راحت بول رہا ہوں۔ تم تمام ائیر پورٹس اور بندرگاہ کی چیکنگ ٹائٹ کرا دو۔ وزارت دفاع میں جو ابھی واردات ہوئی ہے اس میں بھارتی ایجنٹس کے ملوث ہونے کے شواہد ملے ہیں اور یہ لوگ کسی بھی حلیے میں کسی بھی دوسرے ملک میں فرار ہو سکتے ہیں"۔ انسپکٹر راحت نے کہا۔

"او۔ کے سر، حکم کی تعمیل ہو گی"۔ دوسری طرف سے سب انسپکٹر عارف نے جواب دیا۔ "او۔ کے خداحافظ"۔

"اب ایک آخری سوال کا جواب بھی دے دیں"۔ طاہر نے انسپکٹر راحت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جب دوسرے گارڈ کی مجرموں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ کیا اس دوران ان مجرموں سے کوئی چیز مثلاً گھڑی، انگوٹھی، رومال یا اس ٹائپ کی کوئی چیز گری تھی"۔ طاہر نے پوچھا۔

"پولیس نے تفصیل سے کمرہ چیک کیا ہے۔ ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ مجرم دراصل تربیت یافتہ لوگ تھے"۔ انسپکٹر راحت نے جواب دیا۔ طاہر اگرچہ کچھ دیر پہلے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ تاہم اس نے ایک بار پھر کمرے کو بغور دیکھنا شروع کر دیا "اوہ" اچانک طاہر نے دروازے کے کھلے پٹ کے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا جہاں پر ٹیلی فونک کارڈ پڑا ہوا تھا۔ لیکن یہ دیوار کے ساتھ اس طرح چپکا ہوا تھا کہ عام طور پر نظر نہیں آتا تھا۔ طاہر نے تیزی سے کارڈ اٹھا لیا۔

"راحت بھائی۔ آپ گارڈز کو فون کر کے پتا کریں کہ آیا یہ کارڈ ان کا ہے۔ اگر نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ یہ مجرموں کی جیب سے گرا ہو گا"۔ طاہر نے کہا۔

انسپکٹر راحت نے باری باری دونوں گارڈز کو موبائل کے ذریعے فون کیا اور ان سے پتا چلا کہ یہ ان کا نہیں۔

"اب آپ ایسا کریں کہ اس ٹیلی فونک کمپنی کی ہیلپ لائن سے رابطہ کر کے پوچھیں کہ اس کارڈ سے آخری کال کہاں سے اور کہاں پر کی گئی ہے"۔ طاہر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر راحت نے ہیلپ لائن سے رابطہ کر کے اس کارڈ کا نمبر بتایا چنانچہ چند ہی لمحوں بعد پتا چل گیا کہ فون آگرہ میں کیا گیا تھا اور پھر ہیلپ لائن نے اسلام آباد کا نمبر بھی بتا دیا جہاں سے کال کی گئی تھی۔

"اوہ..... اب آپ ایسا کریں کہ ٹیلی فون کے مرکزی دفتر فون کر کے اس نمبر کے بارے میں معلوم کریں کہ کس علاقے کی کونسی کوٹھی ہے"۔ طاہر نے جذباتی لہجے میں کہا۔ چنانچہ انسپکٹر راحت نے فون کر کے معلوم کیا تو بلیو ایریا کی ایک کوٹھی کا نمبر بتایا گیا۔

چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد انسپکٹر راحت اپنی پوری فورس کے ساتھ بلیو ایریا کی طرف رواں دواں تھے۔ طاہر اور طیب اُن کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لوگ فائل بھارت ہی بھجوا چکے ہوں"۔ طیب نے پہلی مرتبہ بات کرتے ہوئے کہا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ تمام عرصہ خاموش رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اتنی جلدی فائل نہیں بھجوا سکتے کیونکہ ظاہر ہے کہ انہوں نے اسے کسی محفوظ راستے سے ہی بھیجنا ہے۔ اب وہ عام ڈاک کے ذریعے تو اسے بھجوانے سے رہے"۔ انسپکٹر راحت نے جواب دیا۔ باقی راستہ گاڑی میں خاموشی رہی۔

مطلوبہ کوٹھی تک پہنچتے ہی پولیس کمانڈوز نے چاروں طرف سے کوٹھی کو گھیرے میں لے لیا اور انسپکٹر راحت کا اشارہ پاتے ہی چار مستعد کمانڈوز بجلی کی سی تیزی سے کوٹھی کے اندر کود گئے۔

انسپکٹر راحت، طاہر اور طیب مطمئن نظر آ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ مجرم فوراً گرفتار ہو جائیں گے اور چند ہی لمحوں میں فائل برآمد ہو جائے گی۔ مگر..... انہیں شدید دھچکا لگا جب اندر جانے والے کمانڈوز خالی ہاتھ لوٹے اور انہوں نے بتایا کہ کوٹھی خالی پڑی ہے۔

"اوہ..... فائل باہر چلی گئی تو ملکی دفاع کو بہت نقصان

پہنچے گا"۔ انسپکٹر راحت نے انتہائی پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں..... یہ تو واقعی بڑا ہاتھ ہو گیا"۔ طاہر نے بھی انتہائی پریشان لہجے میں کہا۔

"ایک طریقے سے مجرم ٹریس ہو سکتے ہیں"۔ طیب نے کہا۔ "وہ کیسے"۔ طاہر نے چونک کر پوچھا۔

"اس عمارت کے باہر لگی ہوئی پلیٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمارت کیپیٹل سٹیٹ ایجنسی کی ملکیت ہے اور مجرموں نے ظاہر ہے کہ یہ عمارت کرائے پر حاصل کی ہو گی اور وہاں اپنے کوائف اور مستقل رہائش کا بھی اندراج کرایا ہو گا۔ اگر کیپیٹل سٹیٹ ایجنسی سے معلومات حاصل کی جائیں تو ممکن ہے کہ مجرموں کے بارے میں کچھ سراغ مل جائے۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر انسپکٹر راحت نے سٹیٹ ایجنسی سے رابطہ کیا اور وہاں سے معلوم ہوا کہ چند روز قبل دو آدمیوں نے اس عمارت کو کرائے پر حاصل کیا تھا اور ان آدمیوں نے اپنے جو کوائف وہاں درج کرائے تھے اُن کے مطابق وہ اسلام آباد کے مضافات کے کوئی زمیندار ہیں۔ جس دیہات کا ایڈرس انہوں نے لکھوایا تھا وہاں سے جب انسپکٹر راحت نے پتا کرایا تو سب کوائف جعلی ثابت ہوئے۔ انسپکٹر راحت چکرا کر رہ گئے۔ اوپر سے دباؤ کافی بڑھ گیا تھا اور احکام بالا کی طرف سے کئی کالیں آچکی تھیں جن میں فائل کی فوری برآمدگی کا حکم دیا گیا تھا۔

"اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہے ہیں۔ کوئی کلیو ہی نہیں مل رہا"۔ انسپکٹر راحت نے مایوس لہجے میں کہا۔

"اوہ..... ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں"۔ اچانک طیب نے اچھلتے ہوئے کہا۔

"اگر غور کیا جائے تو دونوں بھارتی ایجنٹ خلیے بدل کر کام کر رہے ہیں اور ان کی نفسیات یہ ہے کہ یہ لوگ ہوٹل میں کمرے لینے کی بجائے کرائے کی کوٹھی لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر اسی پہلو کو سامنے رکھ کر تلاش کیا جائے تو نو پرابلم۔ ان کا فوراً پتا چلایا جا سکتا ہے"۔ طیب نے کہا۔

"وہ کیسے؟" انسپکٹر راحت نے بے اختیار پوچھا۔

"آپ اسلام آباد کی تمام سٹیٹ ایجنسیوں سے رابطہ کریں اور معلوم کریں کہ ان دونوں میں اسلام آباد میں کونسی کوٹھیاں کرائے پر لی گئی ہیں۔ خاص طور پر کوئی ایسی کوٹھی جسے کرائے پر لینے کے لیے دو آدمی اکٹھے آتے ہوں۔ چونکہ یہ دونوں بھارتی ایجنٹ یہاں اجنبی ہیں اور کسی اجنبی علاقے میں اگر دو افراد ہوں تو ان کی نفسیات ہوتی ہے کہ اکیلے جانے کی بجائے دونوں اکٹھے جاتے ہیں کیوں کہ انہیں

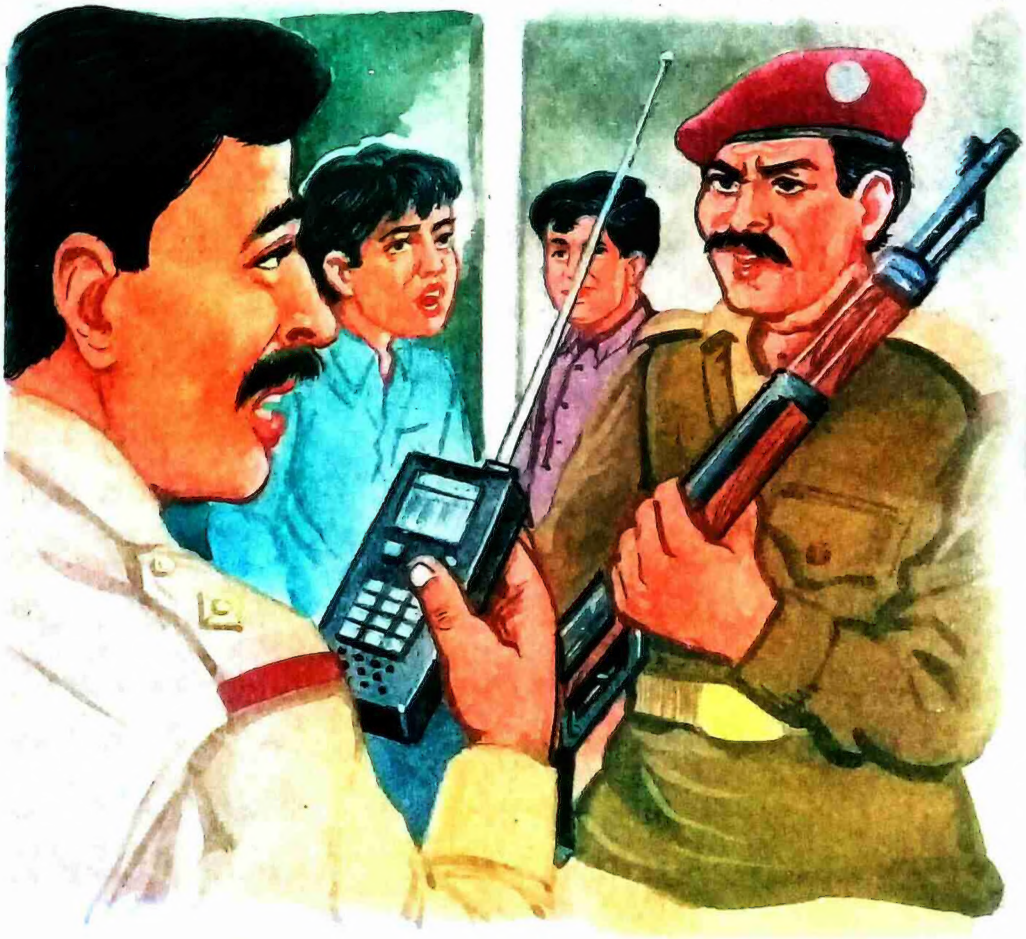

علاقوں کا پتا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ چند روز تک یہیں قیام کریں گے اور جب پولیس ان کی تلاش میں تھک کر مایوس ہو جائے گی تو پھر اطمینان سے فرار ہو جائیں گے۔ لہٰذا یقینی بات ہے کہ یہ لوگ ابھی اسلام آباد ہی میں روپوش ہیں"۔ طیب نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

انسپکٹر راحت نے تمام سٹیٹ ایجنسیوں سے رابطہ کیا۔ چنانچہ ایک سٹیٹ ایجنسی کی طرف سے ایک ایسی کوٹھی کی نشاندہی کی گئی جسے کل شام ہی دو آدمیوں نے کرائے پر حاصل کیا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس جگہ بھی وہی اسلام آباد کی مضافاتی بستی کے زمیندار والا ایڈرس لکھوایا گیا تھا جو پچھلی سٹیٹ ایجنسی میں درج کرایا گیا تھا۔

انسپکٹر راحت دوبارہ پھر اپنی فورس کے ساتھ ایف سیون ایریا کی طرف روانہ ہو گئے۔ مطلوبہ کوٹھی پر پہنچتے ہی پولیس نے چاروں طرف سے کوٹھی کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیس کمانڈوز برق رفتاری سے اندر کود گئے۔ پھر یکایک اندر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ انسپکٹر راحت' طاہر اور طیب کی سانسیں رکی ہوئی تھیں کہ دیکھیے آنے والے لمحات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک گھنٹے کے قریب مسلسل فائرنگ ہوتی رہی۔ کمانڈوز نے کوٹھی کا گیٹ کھول دیا اور انسپکٹر راحت' طاہر اور طیب پولیس کی نفری کے ہمراہ اندر گھس گئے۔ دراصل بھارتی ایجنٹوں نے گرفتاری دینے کی بجائے مقابلے کو ترجیح دی تھی اور کمانڈوز پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ جوابی فائرنگ کے نتیجے میں دونوں مارے گئے تھے اور دونوں کی لاشیں کوٹھی کی چھت پر پڑی ہوئی مل گئیں۔ تلاشی کے بعد کوٹھی سے ایسے کاغذات بھی ملے جن سے پتا چلا کہ یہ دونوں "را" کے ایجنٹ سوبھاش اور سنتوش تھے۔ لیکن انسپکٹر راحت سٹپٹا کر رہ گئے کہ پوری کوشش کے باوجود دفاعی فائل کا کوئی سراغ نہ ملا۔ انسپکٹر راحت نے کوٹھی کا چپہ چپہ چھان مارا۔ آخر کچن سے فائل کے جلے ہونے کاغذات مل گئے۔ تمام کھیل ختم ہو چکا تھا۔ بھارتی ایجنٹس ہلاک ہو چکے تھے اور فائل بھی جلائی جا چکی تھی۔ انسپکٹر راحت کو اطمینان تھا کہ دفاعی راز بہرحال بھارت پہنچنے سے بچ گئے۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔ اچانک راستے میں طاہر ایک خیال آتے ہی چونک پڑا۔ "راحت بھائی۔ پلیز گاڑی واپس موڑیئے۔ پاکستان کے دفاعی راز شدید خطرے میں ہیں"۔

"وہ کیسے؟" انسپکٹر راحت نے حیرت سے کہا۔ "میں نے وہاں کوئی ایسی چیز ضرور دیکھی ہے جس سے میری چھٹی حس بار بار خطرے کا الارم دے رہی ہے۔ اب یہ ذہن میں نہیں آرہا کہ میں نے وہاں ایسی کونسی چیز دیکھی ہے۔ آپ گاڑی موڑیں تاکہ وہاں میں تفصیل سے چھان بین کر سکوں"۔ طاہر نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر راحت نے فوراً گاڑی واپس موڑ لی۔

کوٹھی میں طاہر نے تیزی سے تلاشی لینا شروع کر دی۔ ایک دراز کھولتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی سلپ تھی۔ "یہ کیا ہے"۔ انسپکٹر راحت نے پوچھا۔ "مجرم مرنے سے پہلے آکر ہاتھ کر ہی گئے"۔ طاہر نے طویل سانس لے کر کہا۔ "وہ کیسے" انسپکٹر راحت کے لہجے میں حیرت تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ مجرموں نے دراصل فائل کو ایک مائیکرو فلم میں تبدیل کیا اور فائل جلا دی۔ جلی ہوئی فائل دیکھ کر ہم مطمئن ہو گئے کہ ہمارے راز بھارت جانے سے بچ گئے۔ میرے ذہن میں ایک خلش سی تھی کہ میں نے کوئی مشکوک چیز دیکھی ہے اور وہ یہی سلپ تھی۔ آپ اس سلپ کو پڑھیں کہ یہ ایک پرائیویٹ پوسٹل کمپنی کی رسید ہے انہوں نے مائیکرو فلم کو ایک پیکٹ میں بند کیا ہو گا اور پیکٹ انہوں نے اس پرائیویٹ پوسٹل کمپنی کے ذریعے بھارت بھیج دیا۔ کیونکہ اس رسید پر بھارت کے شہر آگرہ کا پتا لکھا ہوا ہے"۔ طاہر نے تفصیل سے کہا۔

"اوہ..... یہ تو بہت بڑا ہاتھ ہو گیا ہے"۔ انسپکٹر راحت نے رسید دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ' یہ رسید مجھے دکھایئے" طیب نے انسپکٹر راحت کے ہاتھ سے رسید لیتے ہوئے کہا۔ "مائیکرو فلم پر

مشتمل پیکٹ صرف چند گھنٹے پہلے روانہ کیا گیا ہے۔ جبکہ پوسٹل سروس عام طور پر شام کو روانہ ہوتی ہے۔ آپ اس کمپنی کے آفس چلیں"۔ یہ لوگ برق رفتاری سے اس پوسٹل سروس کے آفس روانہ ہو گئے۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب انہیں پتا چلا کہ صرف دو منٹ کے بعد ڈاک روانہ ہونے والی تھی۔ اگر وہ دو منٹ لیٹ ہو جاتے تو اہم ترین دفاعی راز ان کے ہاتھ سے نکل جاتے۔ انسپکٹر راحت نے اپنا خصوصی کارڈ دکھا کر وہ پیکٹ حاصل کیا۔ جب اسے کھولا گیا تو طاہر کا تجزیہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ پیکٹ کے اندر واقعی دفاعی فائل پر مشتمل مائیکرو فلم موجود تھی۔ یہ لوگ ایک مرتبہ پھر اپنی ذہانت اور جدوجہد سے ملک کے اہم دفاعی راز بچانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

اگلے روز کے اخبارات ایک بار پھر طاہر' طیب اور انسپکٹر راحت کے کارنامے سے بھرے ہوئے تھے۔

آیئے طاہر اور طیب کی طرح

آپ بھی جاسوس بنیے!

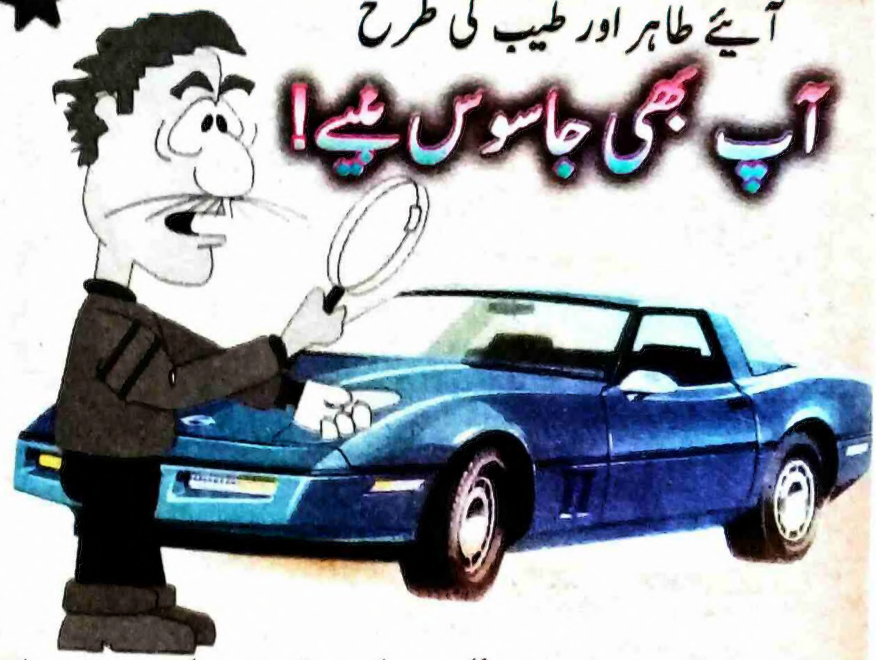

انسپکٹر نادر گزشتہ روز ایک مقامی ٹیلی ویژن سٹور میں ہونے والی ڈکیتی کے سلسلے میں تفتیش کر رہے تھے۔ ڈاکوؤں نے بڑی ہوشیاری سے سٹور کے چوکیدار کو پکڑ کر اس پر بری طرح تشدد کیا اور اس سے سٹور کی چابیاں حاصل کیں۔ پھر اپنی بڑی لاری کو گودام میں لائے اور تمام ٹیلی ویژن سیٹ اُڑا لے گئے۔ واردات کے بعد کمپنی کا چوکیدار چٹان خان بھی غائب تھا۔

بالآخر اگلے روز چوکیدار علاقے کے پولیس اسٹیشن پر زخمی حالت میں حاضر ہوا اور اپنی روداد بیان کی۔ .....اس وقت انسپکٹر نادر چوکیدار چٹان خان ہی کا بیان سن رہے ہیں:

"صاحب! میں ڈیوٹی پر حاضر تھا کہ نیلے رنگ کی سپورٹس کار آکر رُکی اور اس میں سے دو آدمی تیزی سے اُترے اور انہوں نے آتے ہی مجھے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی شکلیں دیکھتا انہوں نے میرے سر پر کپڑا ڈالا' مجھ سے گودام کی چابیاں چھین لیں اور مجھے کار کے پیچھے ڈگی میں بند کر دیا۔ پھر کچھ معلوم نہیں کہ مجھے کار کی ڈگی میں ڈالے کہاں کہاں گھومتے رہے۔ آخر کئی گھنٹوں کے بعد انہوں نے مجھے شہر سے باہر ویران علاقے میں پھینک دیا"۔ چوکیدار نے یہ تمام بیان بغیر رُکے فر فر ریکارڈ کرا دیا۔

"صاحب! مجھے یقین ہے کہ آپ انہیں جلد گرفتار کر لیں گے" چٹان خان نے کہا۔

"ہم انہیں ضرور گرفتار کر لیں گے۔ تم فکر نہ کرو! اصل میں تم نے جو کچھ اپنے بیان میں کہا ہے اس کے مطابق ہم نے اس گروہ کا ایک رکن تو گرفتار کر ہی لیا ہے!" انسپکٹر نادر نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انسپکٹر نادر نے کس فرد کو گرفتار کیا؟

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 دسمبر 2002ء

نومبر 2002ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے بے شمار عنوان موصول ہوئے جن میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوانات پسند آئے اور ان کے مطابق بذریعہ قرعہ اندازی یہ 6 ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

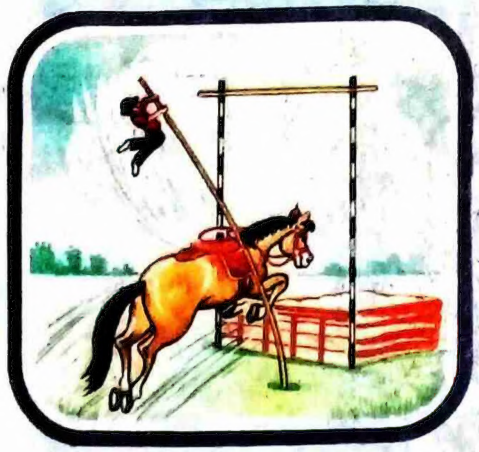

★ عثمان آصف، سیالکوٹ ("ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار": 100 روپے کی کتابیں)

★ محمد نعیم، گڑھی حبیب اللہ ("تجھ سے اونچی میری چھلانگ!" دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

★ محمد رضا گوندل، کھاریاں ("سوار سواری۔ دونوں کھلاڑی" تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

★ شمس الرحمان پشاور ("جو جیتا وہی ہے کھلاڑی" چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

★ عبید حیات، پنڈی گھیب ("دوڑ میری جیت تمہاری" پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

★ محمد صدیق بھٹہ، منگلا ڈیم ("ٹوان دن" چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)